جاسوسی دنیا
75

تجوری کا گیت

جاسوسی دنیا سیریز نمبر ۱۴

ابنِ صفی

۱۹۵۳

تعاقب

شہر کے باہر سنسان اور تاریک سڑک پر ایک شاندار اور قیمتی کار اندھیرے کا سینہ چیرتی ہوئی کسی نامعلوم منزل کی طرف جا رہی تھی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ آسمان پر گرد و غبار نہ ہونے کی وجہ سے ستاروں کی مدھم روشنی اور اندھیرے کے امتزاج نے ایک پُراسرار فضا پیدا کر دی تھی۔ دفعتاً کار ایک جگہ رُک گئی۔ پھر اسے سڑک کے کنارے اُگی ہوئی قدِ آدم جھاڑیوں میں اتار دیا گیا اور دوسرے ہی لمحے میں دو آدمی کار سے اتر کر سڑک کے کنارے آ کھڑے ہوئے۔ اُن میں سے ایک اپنے کاندھے پر ایک موٹی سی رسّی کا بنڈل لادے

ہوئے تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سڑک کے آر پار دو درختوں میں اس طرح رسّی باندھ دی جیسے وہ کسی کا راستہ روکنا چاہتے ہوں۔

اس کام میں فراغت پانے کے بعد وہ پھر جھاڑیوں میں آ بیٹھے۔

"اسے درد سری نہ کہو، وہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"یہ تم اسی لونڈے کے لیے کہہ رہے ہو نا، جسے تم نے کل دکھایا تھا۔"

"اتنی لاپروائی سے اس کا تذکرہ نہ کرو۔"

"چھوڑو بھی تم نے خواہ مخواہ اسے ہوّا بنا رکھا ہے۔"

"خیر بھئی! مُجھے تو اس وقت بھی یقین نہیں کہ ہم اُسے پکڑ ہی لیں گے۔"

"یار تم خواہ مخواہ مُجھے تاؤ نہ دِلاؤ۔ وہ بھی ہماری طرح آدمی ہے۔ بھُوت نہیں۔"

"میں اسے بھُوت ہی سمجھتا ہوں۔"

"تم بزدل ہو۔"

”کیا کہا!“ دوسرا تلخ لہجے میں بولا۔

”خیر۔۔۔ خیر۔۔۔ اس وقت ہمیں آپس میں تکرار نہ کرنی چاہیے۔“

دوسرے نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

”اب تک اسے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ وہ ہمارے سامنے روانہ ہو چکا تھا۔“ دوسرے نے کہا۔

”مُمکن ہے راستے میں کہیں رُک گیا ہو۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر اُسے اتنی اہمیت کیوں دی جارہی ہے۔“

”ہم جانتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں ٹانگ ضرور اڑائے گا اور یہی نہیں ہمیں یہاں بہت کُچھ کرنا ہے۔ پولیس کی طرف سے تو اطمینان ہے۔ وہ ہمارا کُچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ لیکن وہ بڑا ذہین ہے اور سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ ایک اخبار کا رپورٹر بھی ہے۔ پس ذرا سا اشارہ مل جانا چاہیے اس کے بعد تو وہ پوری پوری اسکیمیں اتنی وضاحت کے ساتھ چھاپ دیتا ہے جیسے وہ بھی مشوروں میں شریک

رہا ہو۔"

"تو اس کا خاتمہ ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔"

"آج تک اس کا موقعہ ہی نصیب نہیں ہوا۔"

"کیا حماقت کی باتیں کر رہے ہو۔ کیا ہم اس وقت اسے ٹھکانے نہیں لگا سکتے۔"

"مگر ہمیں اس کا حکم کہاں ملا ہے۔ ہمیں تو پکڑ کر لے جانا ہے۔"

"اس میں نہ جانے کونسی مصلحت ہے جب وہ ایسا آدمی ہے تو اسے ختم ہی کر دینا چاہیے۔"

"بات یہ نہیں! اُسے پولیس سے ہمدردی نہیں ہے وہ محض روپیہ اینٹھنے کے لیے شریف آدمیوں کے کام میں روڑے اٹکایا کرتا ہے۔ یعنی ادھر سے بھی ہاتھ گرم کرتا ہے اور ادھر سے بھی میرا خیال ہے کہ اس سے معاملے کے متعلّق کسی قسم کا سمجھوتہ کیا جائے گا۔"

”تو کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ راضی ہو جائے گا۔“

”چھوڑو بھی ہمیں اس سے کیا غرض۔ ہمارے ذمے جو کام ہے ہمیں اسے کرنا چاہیے۔“

اِس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ جنگل کے سنّاٹے میں جھینگروں کی آوازیں ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے وقت نے اپنی عظیم تنہائی سے اُکتا کر کوئی گیت چھیڑ دیا ہو۔

”لیکن انور پولیس والوں سے کس طرح روپیہ اینٹھتا ہے۔“ ایک نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

”اُن کے راز افشا کر دینے کی دھمکی دے کر وہ یہاں کے سارے پولیس آفیسروں کی کمزوریوں سے اچھّی طرح واقف ہے۔“

”اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تو رہتی ہے۔“

”ہاں اس کا نام رشیدہ ہے وہ بھی کم نہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ یہ دونوں ہم جیسے

شریف آدمیوں کے لیے ہمیشہ دردِ سر بنے رہتے ہیں۔"

"وہ لڑکی خوبصورت بھی کافی ہے۔"

"اوہ تو کیا اس پر عاشق ہونے کا ارادہ ہے۔"

"دونوں معنی خیز انداز میں ہنسنے لگے۔"

"مگر یار اتنا یاد رکھو کہ وہ بھڑوں کا چھتّہ ہے۔"

"ہونہہ۔۔۔ بہت دیکھی ہیں۔ صوبیدار میجر صاحب کی لڑکی سے زیادہ خطرناک نہ ہو گی۔"

"خیر ہٹاؤ میں بحث کرنا نہیں چاہتا۔"

"اوہ سنو! آواز آ رہی ہے۔ موٹر سائیکل کی آواز۔ تم دوسری طرف چلے جاؤ۔"

"ایک اُٹھ کر سڑک کے دوسرے کنارے پر چلا گیا۔"

دور موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹس دکھائی دے رہی تھی اور جنگل مشین کی کرخت

آواز سے گونج رہا تھا۔ روشنی سڑک پر پھیل رہی تھی۔ اچانک موٹر سائیکل رُک گئی۔ شاید انور نے سڑک پر تنی ہوئی رسّی دیکھ لی تھی۔ قبل اس کے کہ وہ موٹر سائیکل کو موڑتا یہ دونوں اس کے قریب پہنچ گئے۔

"خبر دار۔۔۔ مشین بند کرو۔" ایک نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

انور نے مشین بند کر دی اور دونوں پیر ٹیکے موٹر سائیکل پر ہی بیٹھا رہا۔

"اگر تم نے ذرّہ برابر بھی حرکت کی تو گولی تمہارا بھیجا اڑا دے گی۔" دوسرا بولا۔

انور بچّوں کی طرح کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

"یار کیوں ڈراتے ہو اس اندھیرے جنگل میں۔" انور نے کہا۔ "میرے جیب میں ڈھائی روپے اور نرگس کی تصویر کے علاوہ کُچھ اور نہیں۔ چاہو تو روپے لے لو۔ لیکن نرگس کی تصویر ہرگز نہ دوں گا۔ کیونکہ وہ والد صاحب کو بہت پسند ہے۔"

ان میں سے ایک بے ساختہ ہنس پڑا۔ لیکن دوسرا غرّا کر بولا۔ "بکواس بند کرو۔ ہمارے ساتھ چلو۔"

”میں اس چھوٹی سی گاڑی پر دو آدمیوں کو کس طرح لاد سکوں گا۔ اگر چالان ہو گیا تو؟“ انور تشویش ظاہر کرتا ہوا بولا۔

”گاڑی چھوڑ کر ہٹ آؤ۔“

انور نے موٹر سائیکل کنارے کھڑی کر دی اور ان کے قریب آ گیا۔

”اس کے ہاتھ پیر باندھ دو۔۔۔!“ ایک نے دوسرے سے کہا۔

”ٹھہرو۔۔۔!“ انور بولا۔ ”آخر تم چاہتے کیا ہو۔“

”تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔“

”تو پھر ہاتھ پیر باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ چلنے سے انکار تو نہیں کیا۔“ انور نہایت سنجیدگی سے بولا۔

”تم بڑے مکّار ہو۔“

”بدتمیز۔۔۔!“ انور تلخ لہجے میں بولا۔ ”تمہیں بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔“

"باندھ لو اسے۔" وہ گرج کر بولا۔

ایک آدمی جیب سے ایک پتلی سی ڈور نکال کر انور کی طرف بڑھا۔ انور نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔

اتنا یاد رکھو کہ میں گِن گِن کر بدلہ چکانے کا عادی ہوں۔ "انور نے آہستہ سے کہا۔

اس شخص نے جو اس کے ہاتھ باندھنے جا رہا تھا اس کے جملے پر طنز آمیز مُسکراہٹ کے ساتھ قہقہہ لگایا جیسے ہی وہ ڈوری لے کر آگے کی طرف جھکا انور نے اپنے داہنے پیر کا گھٹنا اٹھا دیا اور دوسرے ہی لمحے میں وہ چیخ کر پیچھے کھڑے ہوئے ساتھی پر جا پڑا۔ انور ایک ہی جست میں جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہو چکا تھا۔

دونوں اٹھ کر اس کے پیچھے لپکے۔

"دیکھ لیا تم نے۔" ان میں سے ایک نے جھلّا کر کہا۔

"خُدا کی قسم زندہ نہ چھوڑوں گا۔" چوٹ کھائے ہوئے آدمی نے غصیلی آواز میں

کہا اور لنگڑاتا ہوا جھاڑیوں میں دوڑنے لگا۔ لیکن شاید ابھی اس کی شامت اچھّی طرح نہیں آئی تھی وہ بے تحاشا جھاڑیوں میں گُھستا پھر رہا تھا۔ اس کا ساتھی اُس کے پیچھے تھا۔

"میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ ایک بار پھر اپنے غصّے کا اظہار کر ہی رہا تھا کہ دفعتاً ایک بڑا سا پتھّر اس کی پیشانی پر پڑا اور وہ چیخ مار کر اُلٹ گیا۔ اس کا ساتھی پہلے تو اس کی طرف جھپٹا لیکن پھر خوفزدہ ہو کر اُسی کے ساتھ زمین پر لیٹ گیا۔ وہ اپنی سانس روکے آہٹ لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور پھر سنّاٹا چھا گیا۔

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ تھوڑی دیر تک خوفزدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر اپنے بے ہوش ساتھی کی طرف متوجّہ ہوا جس کی پیشانی سے خون بہہ بہہ کر چہرے پر پھیل گیا تھا۔ اس نے اسے کاندھے پر اٹھایا اور جھاڑیوں سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ چاروں طرف لامتناہی سنّاٹا جاری تھا وہ کسی نہ کسی طرح اپنے بے ہوش ساتھی کو کار تک لے آیا۔

جھاڑیوں سے کار سڑک پر نکالی۔ کار کا رُخ شہر کی بجائے دیہی علاقے کی طرف تھا، جیسے ہی کار سڑک پر مڑی انور جھاڑیوں سے نکل کر پیچھے لگیج کیریئر پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد کار فرّاٹے بھرنے لگی۔

تقریباً پانچ یا چھ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کار ایک احاطے کے پھاٹک پر رُک گئی۔ کار ڈرائیو کرنے والے نے اپنے بے ہوش ساتھی کو پھر کاندھے پر لادا اور احاطے کا پھاٹک کھول کر اندر چلا گیا۔

انور آہستہ سے لگیج کیریئر سے اترا اور کار میں بیٹھا۔۔۔ اس نے بڑی پھُرتی سے انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی شہر کی طرف گھما دی اور دیکھتے ہی دیکھتے احاطہ میلوں پیچھے رہ گیا۔ وہ اتنی سنجیدگی سے بیٹھا کار ڈرائیو کر رہا تھا جیسے وہ خود اس کی اپنی کار ہو۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مُسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

انور کے کردار میں عجیب و غریب بات تھی کہ وہ کسی کو معاف کرنا تو جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کا فلسفۂ حیات انتقام تھا۔ اس کا قول تھا کہ زندگی کا انحصار صرف

انتقام پر ہے۔ نظامِ فطرت کی اصل بنیاد انتقام ہی ہے جسے دُنیا والوں نے مختلف نام دے رکھے ہیں۔ بہر حال اس وقت اس نے محض اپنی انتقامی اسپرٹ کے تحت یہ دیکھنے اور سمجھنے کی زحمت گوارانہ کی کہ اُس پر حملہ کرنے والے کون تھے اور وہ اسے کہاں اور کیوں لے جانا چاہتے تھے بس وہ ان کی قیمتی کار لے بھاگا اور ٹھیک اسی جگہ پہنچ کر جہاں ان لوگوں نے اُسے روکنے کے لیے سڑک پر رسّی تانی تھی کار کھڑی کر دی اور نیچے اُتر کر اس نے ایک بڑا سا پتھّر اٹھایا اور ہیڈ لائٹ کے شیشے چکنا چور کر دیے اور واپس لوٹنے کی تیّاری کرنے لگا۔

لیکن وہ اپنی اس انتقامی کارروائی سے مطمئن نہیں تھا اچانک اسے ایک اور تدبیر سوجھی۔ اس نے پٹرول کی ٹینکی کھول کر اس میں دیا سلائی دِکھادی اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ کی لپٹوں نے پوری کار کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ انور کے ہونٹوں پر فاتحانہ مُسکراہٹ پھیل گئی۔

پھر وہ تیزی سے جھاڑیوں میں گھُس گیا۔ اس کی موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی تھی۔ چنانچہ چند لمحوں میں وہ تیزی سے شہر کی طرف جارہا تھا۔ اس نے وہ رسّی

بھی نہیں کھولی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ رسّی کھولے دیتا ہے تو پولیس والے کافی درد سری سے بچ جائیں گے۔ وہ دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کیونکہ اس نے سراغ رسانی والوں کے لیے ایک اچھّا خاصا معمّہ مہیّا کر دیا تھا۔ کل انسپکٹر آصف کی بوکھلاہٹ قابلِ دید ہو گئی۔ پھر اچانک وہ چونک پڑا۔ آخر وہ لوگ تھے کون اور اسے کہاں لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن اب اس کے متعلّق سوچنا ہی بے کار تھا اور پھر وہ اس واقعے کو ہر طرح اپنے ذہن سے نکال دینے کی کوشش کرنے لگا جیسے اس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

وہ بہت زیادہ دور اندیشی کا قائل نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دُنیا کے بڑے سے بڑے حادثے کا مقابلہ صرف حاضر دماغی سے کیا جا سکتا ہے۔ منطقی دلائل اور دور اندیشی قطعی فضول چیزیں ہیں۔ دور اندیشی غَلَط راستے پر بھی لے جا سکتی ہے کیونکہ دور اندیشی کا تعلّق مستقبل سے ہے اور مستقبل اندھیرے میں گُم ہے۔ منطقی دلائل میں تفہیم کی بنیادی غَلَطی کے امکانات بھی ہو سکتے ہیں لہٰذا جب بنیاد ہی غَلَط ہو گئی تو اُس کے لیے دلائل اور جواز کیلیے سر مارنا دیوانگی کے علاوہ کُچھ

نہیں۔

اِسی نظریے کے تحت وہ ذہن کی ایسی تربیت کا حامی تھا جو انسان کو پیش آنے والے حادثات سے بجا طور پر نجات دلا سکے۔ اس تربیت کو اس نے حاضر دماغی کا نام دے رکھا تھا۔

وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ شخص جو حاضر دماغ نہ ہو اسے زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ وہ اسی طرح زندہ رہتا ہے جیسے تپ دق کا مریض ناکارہ اور بے کار۔

اس کے خیال کے مطابق پوری زندگی عظیم الشّان مقابلہ تھی جس میں انسان آگے بھی بڑھ سکتا ہے اور دوڑنے والوں کے پیروں تلے روندا بھی جا سکتا ہے۔

تقریباً ڈیڑھ بجے وہ گھر پہنچا۔ فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کمرے کی روشنی بارجے پر پھیلی ہوئی تھی۔ انور کو تعجّب ہوا کہ اس وقت اس کے کمرے میں اس کی عدم موجودگی میں کون بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے اُسے خیال آیا کہ ممکن ہے رشیدہ ہو۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ وہ کب کی سو گئی ہو گی اور پھر فلیٹ کی کُنجی خود اس کے پاس

تھی۔ رشیدہ نے کمرہ کیسے کھول لیا۔ اس نے برابر والے فلیٹ کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو اندر نیلی روشنی دکھائی دی، جو اس بات پر دلالت کر رہی تھی کہ رشیدہ سو رہی ہے۔۔۔ وہ بہت احتیاط سے اپنے فلیٹ میں داخل ہوا۔ اس کے لکھنے کی میز پر۔۔۔ اس کی طرف پشت کئے ہوئے کوئی بیٹھا نہایت انہماک سے کُچھ پڑھ رہا تھا۔ انور کے داخل ہوتے ہی وہ مڑا اور اس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی اس کا اندازہ کُچھ اتنا پُر اطمینان تھا جیسے وہ اپنے ہی کمرے میں کسی مہمان کا استقبال کر رہا ہو۔ انور نے بھی اپنی عادت کے مطابق ذرّہ برابر حیرت کا اظہار نہیں کیا۔

یہ ایک طویل القامت اور جاذبِ توجّہ شخصیت کا آدمی تھا۔ چہرے پر سیاہ رنگ کی گھنی داڑھی تھی جس کے متعلّق انور نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ مصنوعی ہے۔ آنکھوں پر سرمئی رنگ کے شیشوں کا چشمہ تھا جس سے آنکھیں تقریباً چھپ گئی تھیں۔

"غالباً میں انور صاحب سے ملنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔" اس نے انتہائی

خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب۔۔۔!" انور ایک قدم پیچھے ہٹ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تو کیا آپ۔۔۔ میں خود انور صاحب کی تلاش میں آیا ہوں۔ کیا یہ ان کا مکان نہیں معاف کیجیے گا۔" انور جانے کے لیے مڑا۔

"ٹھہرو۔۔۔!" اجنبی درشت لہجے میں بولا۔

انور رُک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم بہت نڈر آدمی ہو۔" اجنبی اٹھتا ہوا بولا۔ "لیکن تم ہر ایک کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

"میں تم سے ہرگز نہیں پوچھوں گا کہ تُم کون ہو۔" انور بے پروائی سے بولا۔ "خیریت اسی میں ہے کہ تُم چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں یہ بھی نہیں پوچھنا چاہتا کہ تم نے میرے فلیٹ کا تالا کیوں توڑا۔"

"یہ غَلَط ہے۔ میں نے فلیٹ کا تالا ہرگز نہیں توڑا۔" اجنبی نے ناخوش گوار لہجے

میں کہا۔

"تمہاری دوست رشیدہ مُجھے یہاں بِٹھا کر چلی گئی ہے۔ غالباً وہ سوتے اٹھی تھی۔"

"خیر۔۔۔ خیر۔۔۔!" انور بیٹھتا ہوا بولا۔ "یہ شریف آدمیوں کے ملنے کا وقت نہیں۔"

"اچھّا تو تم خود کو شریف سمجھتے ہو۔" اجنبی مُسکرا کر بولا۔

"نہیں میں تمہاری شان میں قصیدہ پڑھ رہا تھا۔" انور بیزاری سے بولا۔

"خیر۔۔۔ ہٹاؤ ہٹاؤ۔۔۔ ان باتوں کو۔۔۔ تم نے ہماری ایک اچھّی خاصی کار برباد کر دی۔"

"اور جو میرا اچھّا خاصا وقت برباد کیا تھا۔" انور نے کہا۔ "لیکن میں تم سے ہر گز یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم کون ہو اور مُجھے کیوں پکڑوانا چاہتے تھے۔"

”تم اتنے دلیر نہیں ہو جتنا ظاہر کرتے ہو۔“ اجنبی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”میں تم سے اس کے لیے کوئی سرٹیفکیٹ نہیں چاہتا۔“ انور خشک لہجے میں بولا۔

”پھر فضول باتیں چھڑ گئیں۔“ اجنبی نے کہا۔ ”میں تم سے ایک سمجھوتہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا اسی وقت۔۔۔!“ انور نے کہا۔ ”نہیں اب مُجھے سو جانا چاہیے۔“

”تو کیا میں اس وقت یہاں جھک مارنے آیا ہوں۔“ اجنبی جھلا کر بولا۔

”میں خود یہی سوچ رہا تھا۔“

”دیکھو انور۔۔۔!“ وہ تیز لہجے میں بولا۔ ”یہ داراب کی خواہش ہے کہ تم اس سے سمجھوتہ کر لو۔“

”کون داراب۔۔۔!“ انور طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”وہی بزدل، جو کسی جاسوسی ناول کے ڈاکو کی طرح اپنی شخصیت کو پُر اسرار بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی

کوشش کر رہا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ مُجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں وہ کوئی بہت ہی معمولی آدمی کی جاسوسی ناولیں پڑھ پڑھ کر ڈاکو بنا ہے! میں اسے اتنی اہمیّت نہیں دیتا کہ اس سے کسی قسم کا سمجھوتہ کروں۔ پولیس اس سے سمجھتی رہے گی۔ میں شیر کی کھال میں چھپی ہوئی لومڑیوں کو خوب پہچانتا ہوں۔"

اجنبی مُسکراتا رہا۔ وہ شرارت آمیز نظروں سے انور کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم داراب کو اچھّی طرح سمجھ نہیں سکے۔"

"میں نے خوب اچھّی طرح سمجھ لیا۔" انور بیزاری سے منہ بناتا ہوا بولا۔ "اگر وہ واقعی عقل مند ہوتا تو ایسے ناکارہ آدمیوں کو میرے پکڑنے کے لیے نہ بھیجتا۔"

"لیکن اتنا یاد رکھو کہ وہ خود بہت خطرناک ہے۔"

"ہوگا! مُجھے اس سے کیا؟"

"خیر چھوڑو۔ ہم پھر بہک گئے۔" اجنبی مُسکرا کر بولا۔ "داراب دراصل یہ چاہتا ہے کہ تم اس کے معاملات میں دخل نہ دو۔"

”میں خواہ مخواہ کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔“

”لیکن تم ایک معاملے میں دخل دینے پر مجبور ہو جاؤ گے۔“

”اگر یہ بات ہے تو پھر دُنیا کی کوئی قوّت مُجھے اِس سے باز نہ رکھ سکے گی۔“

”اس سمجھوتے کے سِلسِلے میں تم جتنی رقم چاہو طلب کر سکتے ہو۔“ اجنبی اُس کی بات پر دھیان دیے بغیر بولا۔

”شش۔۔۔!“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”اس قسم کی رقمیں صرف ان مجرموں سے وصول کرتا ہوں جو خود کو قانون کا محافظ کہتے ہیں۔“

”جانتے ہو تمہاری ضد کا کیا انجام ہو گا۔“ وہ انور کو تیز نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

”موت۔۔۔!“ انور مُسکرا کر بولا۔ ”اور میں عرصے سے اس کی تلاش میں ہوں۔“

"تم ابھی بچّے ہو۔" اجنبی بزرگانہ انداز میں بولا۔ "تم جیسے لوگوں کے لیے داراب اچانک موت نہیں پسند کرے گا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ تمہاری زندگی کو جہنّم ضرور بنادے گا۔"

"تو میں زندگی کو جنّت کب سمجھتا ہوں۔"

اجنبی خاموش ہو کر اُسے گھورنے لگا۔

"تو بہر حال تم انکار کر رہے ہو۔" وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

"قطعی۔۔۔!"

"تم شاید سچ مچ داراب کو معمولی سمجھتے ہو۔" اجنبی اٹھتا ہوا بولا۔ "خیر اگر تم داراب کی قوّت کا اندازہ لگانا چاہتے ہو تو کل شام کو پلازا تھیٹر ضرور جانا۔"

"اگر تم چیلنج کر رہے ہو تو ضرور آؤں گا۔" انور مُسکرا کر بولا۔

"یہ چیلنج نہیں بلکہ دعوت ہے۔" اجنبی نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے

کہا۔

اس کے جانے کے بعد انور روشنی گل کر کے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔

نئ مصیبت

دوسرے دِن صُبح انور اپنے نشست کے کمرے میں کوئی چیز تلاش کر رہا تھا۔
تھوڑی دیر بعد اس نے رشیدہ کو پے درپے آوازیں دینا شروع کیں۔

"کیا ہے۔" رشیدہ کمرے میں داخل ہو کر جھلّائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میری ڈائری۔"

"میں کیا جانوں۔"

"یہیں تو تھی۔"

”رہی ہو گی۔ میں کوئی ٹھیکیدار ہوں۔“ رشیدہ تنک کر بولی۔

”اے رشیدہ۔“

”اے انور۔۔۔!“

”میں تمہارے کان اکھاڑ دوں گا۔“

”میں تمہاری ناک اکھاڑ دوں گی۔“

انور خاموش ہو کر اُسے گھورنے لگا۔

”تم نے رات میرا کمرہ کیسے کھولا تھا۔“ انور نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

”کُنجی سے۔“

”مگر کُنجی تو میرے پاس تھی۔“

”میں ہمیشہ تمہارے فلیٹ کی ایک کُنجی اپنے پاس رکھتی ہوں۔“

”لیکن تم نے رات کمرہ کھولا ہی کیوں تھا۔“

”نہ کھولتی تو کیا اپنی نیند خراب کرتی۔ وہ اڑیل ٹٹّو تھا کون۔“

”تمہارے سالے زاد نانا کا چچا۔“ انور ہونٹ بھینچ کر بولا۔ ”میں پوچھتا ہوں تم نے کمرہ کیوں کھولا تھا۔“

”وہ کہہ رہا تھا کہ میں بار جے پر بیٹھ کر انتظار کروں گا۔ میں سمجھی کہ کوئی خاص آدمی ہے اس لیے میں نے کمرہ کھول دیا۔“

”میرے صندُوق سے پانچ ہزار روپے غائب ہو گئے ہیں۔ اس کی ذمّہ دار تم ہو۔“

”پانچ ہزار۔۔۔!“ رشیدہ قہقہہ لگا کر بولی۔ ”کبھی خواب میں بھی دیکھے تھے۔“

”چُپ رہو۔“ انور تیز لہجے میں بولا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ کسی دِن تمہاری ہی وجہ سے میری گردن کٹ جائے گی۔“

”مُجھے اس دِن بڑی خوشی ہو گئی۔ آخر بتاتے کیوں نہیں کہ کیا بات ہوئی۔“

”بیٹھ جاؤ۔“ انور کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

رشیدہ بیٹھ گئی۔ انور کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

"بھئی ابھی دفتر بھی جانا ہے۔" رشیدہ اُکتا کر بولی۔

"ہوں۔۔۔!" انور اُسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔ "ہمیں کسی نئے حادثے کے لیے تیّار رہنا چاہیے۔"

"میری ڈائری کا اس طرح غائب ہو جانا کسی نئی مصیبت کا پیش خیمہ معلوم ہوتا ہے۔"

پھر انور نے اُسے گذشتہ رات کے سارے واقعات بتا دیئے۔

"اور تم نے وہ کار سچ مچ جلا دی۔" رشیدہ نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔۔۔ اور مُجھے افسوس ہے کہ میں اس کے دوسرے ساتھی کو بھی زخمی نہ کر سکا۔"

"تم بعض اوقات سچ مچ بالکل جنگلی ہو جاتے ہو۔" رشیدہ نے کہا۔

”میں نے تمہیں یہ واقعہ اس لیے نہیں بتایا کہ تم اخلاقیات پر ایک لیکچر دے ڈالو۔“

انور نے بیزاری سے کہا۔ ”کہنے کا یہ مطلب ہے کہ ذرا ہوشیاری سے رہنا۔“

”تو کیا سچ مچ تم داراب سے اُلجھنے کا ارادہ رکھتے ہو۔“

”ہاں میں نے اس کا تہیّہ کر لیا ہے اگر میری ڈائری غائب نہ ہوئی ہوتی۔۔۔!“

”تو کیا ڈائری وہی لے گیا ہے، جو کل رات کو آیا تھا؟“ رشیدہ نے پوچھا۔

”میں یہی سوچنے پر مجبور ہوں۔“

”میری رائے ہے کہ تم اس جھگڑے میں مت پڑو۔“ رشیدہ نے کہا۔

”میں تم سے رائے نہیں طلب کر رہا ہوں۔“ انور خشک لہجے میں بولا۔

”اچھّا یہ بتاؤ کہ داراب وہی تھا جو کل رات کو آیا تھا۔“

”میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔“ انور کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”اس نے نہایت

عجیب و غریب طریقوں سے شہر میں وارداتیں کی ہیں۔ محکمہ سُراغ رسانی والوں کے پاس اس کا کوئی ریکارڈ نہیں میرا خیال ہے کہ خود اس کے گروہ سے تعلّق رکھنے والوں کو بھی اِس کا علم نہ ہو گا کہ داراب کون ہے۔"

"آدمی خطرناک معلوم ہوتا ہے۔" رشیدہ کُچھ سوچتی ہوئی بولی۔ "اخباروں میں بھی اس کا تذکرہ رہتا ہے۔"

"اتنا خطرناک بھی نہیں جتنا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اس طرح اپنی پبلسٹی کرا رہا ہے۔۔۔ خود کو ہوّا بنانے کی کوشش میں مشغول ہے۔ یہ طریقہ بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کُچھ دِنوں کے بعد پولیس والے اس سے خوف کھانے لگیں گے۔"

"لیکن وہ تمہیں خواہ مخواہ کیوں چھیڑ رہا ہے۔"

"یہ بھی اُس کی چال ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں کبھی اُس کا سراغ نہ لگا سکوں گا۔ اس لیے اس نے مُجھے اپنی طرف متوجّہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی دانست

میں اگر میں بھی ناکام رہا تو اس کی دھاک بیٹھ جائے گی۔ اگر اُسے مُجھے اپنے راستے سے ہٹانا ہوتا تو وہ مُجھے قتل کرا دیتا۔"

"کیوں قتل کیسے کرا دیتا۔"

"ارے یہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔ اگر وہ دونوں چاہتے تو کل رات ہی کو مُجھے ختم کر دیتے۔"

"ظاہر ہے کہ وہ قتل سے ہچکچاتا نہیں ہے کیونکہ اسی شہر میں کئی ایسے قتل ہوئے ہیں جو اسی کی ذات سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ قطعی غَلَط ہے کہ وہ مُجھ سے کسی قسم کا سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے۔"

"واہ یہ بھی عجیب بات ہے۔"

"بہر حال تمہیں ہر طرح ہوشیار رہنا چاہیے۔ میں نے اس خرگوش کو اس کے اصلی روپ میں ظاہر کرنے کا تہیّہ کر لیا ہے۔"

"تم جانو اس معاملے میں تو تمہیں شاید کُچھ روپیہ بھی نہ مل سکے۔"

”مُجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں تو اسے اس چھیڑ چھاڑ کا مزہ چکھانا چاہتا ہوں۔“

”اب دیکھو اُس جلی ہوئی موٹر کا پولیس کیا اسکینڈل بناتی ہے۔“ رشیدہ نے کہا۔

”آج انسپکٹر آصف کا حلیہ دیکھنے کے قابل ہو گا۔“ انور مُسکرا کر بولا۔

”وہ تو سب ٹھیک ہے۔ لیکن درزی آج پھر تقاضا کر رہا تھا آخر تم اس کو بل کب ادا کرو گے۔“ رشیدہ نے کہا۔

”اوہ۔۔۔ تم واقعی اس وقت بہت حسین معلوم ہو رہی ہو۔“

”میرے پاس اب ایک پائی بھی نہیں ہے۔“ رشیدہ منہ بنا کر بولی۔

”اس کے باوجود بھی تم آج اچھّی لگ رہی ہو۔“

”میں سچ کہتی ہوں کہ ایک پیکٹ سگریٹ کے دام بھی نہ نکال سکوں گی۔“

”تب تو پھر مجھے اپنے ہی حسن کی تعریف کرنی پڑے گی۔“ انور بے بسی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

رشیدہ بُرا سامنہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"خیر یہ لو۔" اُس نے کُنجیوں کا گُچھّا رشیدہ کی گود میں پھینک دیا۔ "جا کر نیلے صندوق سے روپے نکال لو۔ درزی کا بل بھی ادا کر دینا اور میرے لیے سگریٹ بھی لیتی آنا۔"

"میں نہیں جاتی۔"

"دوڑ جاؤ۔ شاباش۔۔۔!" انور نے کہا اور میز پر سے ایک کتاب اٹھا کر پڑھنے لگا۔

رشیدہ منہ بناتی ہوئی چلی گئی۔ انور نے کتاب رکھ کر اخبار کے لیے جاسوسی ناول کی قسط لکھنی شروع کر دی۔ چند لمحوں کے بعد وہ بھی بھول گیا کہ وہ تھوڑی دیر قبل اپنی ڈائری ڈھونڈ رہا تھا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے تک لکھتا رہا۔ اس دوران میں رشیدہ اس کی میز پر سگریٹ کا پیکٹ رکھ کر چلی گئی لیکن اسے خبر نہ ہوئی۔

تقریباً نو بجے وہ پھر آئی۔

"ارے بھئی دفتر چلنا ہے یا نہیں۔"

"اوں۔۔۔!" انور چونک کر بولا۔ "ضرور ضرور۔۔۔ ارے آج میں نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔۔۔ تم کر چکیں کیا؟"

"دیکھو خواہ مخواہ مُجھے غصّہ نہ دلاؤ۔ میں کبھی تنہا ناشتہ کرتی ہوں کہ آج ہی کر لیتی۔"

"چہ چہ۔۔۔ تمہیں مُجھ سے کہنا چاہیے تھا۔"

"میں تم سے کیا کہا کروں۔۔۔!" رشیدہ جھلّا کر بولی۔ "مُجھے ڈر ہے کہ کسی دِن مُجھے تم سے یہ بھی نہ کہنا پڑے کہ دیکھو گُڈّے میاں تمہارے منہ سے رال بہہ رہی ہے۔"

"میں سچ کہتا ہوں۔ رشیدہ نہ جانے کیوں تمہارے سامنے بچّہ بن جانے کو دِل چاہا کرتا ہے۔" انور نے کہا۔

"اچھّا بس بس بیکار باتیں بند۔" رشیدہ نے تیز لہجے میں کہا۔ "اٹھ کر کپڑے

پہنو۔“

انور نے پنسل میز پر پٹخ دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”آج تم نے شیو بھی نہیں کیا۔“

”ٹالو بھئی، روزانہ شیو کرنے سے ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔“ انور نے کہا۔

”پھر وہی فضول باتیں، تمہیں شیو کرنا ہی پڑے گا۔“

”ارے تم تو جان کو آ جاتی ہو۔“

”چلو شیو کرو۔“ رشیدہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔

انور منہ سکوڑتا ہوا غسل خانے میں چلا گیا۔ رشیدہ میز پر بکھری ہوئی کتابیں درست کرنے لگی۔ گھر سے نکل کر دونوں نے ایک ریستوران میں ناشتہ کیا اور دفتر کی طرف روانہ ہو گئے۔ تقریباً دو بجے وہ دونوں لنچ کے لیے دفتر سے نکل رہے تھے کہ سامنے انسپکٹر آصف آتا دکھائی دیا۔

”دیکھا تم نے۔“ انور رشیدہ کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھ کر بولا۔

”تم کل رات کہاں تھے۔“

”ایک یتیم خانے کے لیے چندہ اکٹھا کرتا پھر رہا تھا۔“ انور نے جواب دیا۔

”اڑنے کی کوشش نہ کرو۔ اس بار تم بُری طرح پھنس گئے۔“

”اور میں اچھّی طرح کب پھنستا ہوں۔“

”یہ تمہاری ڈائری ہے۔“ آصف نے جیب سے ایک چھوٹی سی نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا۔

”دیکھوں۔۔۔!“ انور نے ہاتھ بڑھا کر ڈائری اس کے ہاتھ سے لے لی اور اس کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

”ہاں ہے تو میری ہی۔“ انور نے کہا اور ڈائری کو اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

"لاؤلاؤڈائری مُجھے واپس کردو۔" آصف جلدی سے بولا۔

"کیوں۔۔۔!"

"اس کا تعلّق ایک کیس سے ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے تم آج زیادہ پی گئے ہو۔" انور نے کہا۔ "ایک تو تم نے یہی جرم کیا کہ اسے میرے کمرے سے چُرا لائے اور پھر اب خواہ مخواہ دھونس جمانے آئے ہو۔"

"دیکھو میں کہتا ہوں، ڈائری واپس کردو۔"

"کیسی ڈائری۔" انور سنجیدگی سے بولا۔ "تم نے اس ماہ میں ابھی تک میرا حق نہیں ادا کیا۔"

"مُجھے سو روپیوں کی سخت ضرورت ہے۔"

"فضول بکواس مت کرو۔ اب مُجھ پر اس قسم کی دھونس نہیں پڑ سکتی۔ میں نے وہ

قمار خانہ ہی بند کرادیا جس کی دھمکی دے کر تم مُجھ سے روپے وصول کر لیا کرتے تھے۔"

"سنو بھائی انسپکٹر صاحب۔۔۔ اگر تم ایک در بند کرتے ہو تو میں ہزار در کھول لیتا ہوں۔ میرے پاس اس کا کافی ثبوت موجود ہے۔ کہ سیٹھ داؤد بھائی تمہاری دانست میں ہزاروں روپے لوہے کی چور بازاری کر رہا ہے تم نے ابھی حال ہی میں ایک ماخوذ مجرم کو امریکہ کا ویزا دلا کر یہاں سے نکال دیا ہے۔ اس موقعے کی تصویر تک پیش کر سکتا ہوں جب تم ایک دیہاتی لڑکی کو خریدنے کے لیے ٹھونک بجا کر دیکھ رہے تھے۔"

آصف گھبرائے ہوئے انداز میں انور کی طرف دیکھنے لگا۔

"اگر کہو تو دو ایک باتیں اور گنوا دوں۔" انور مُسکرا کر بولا۔

"تم زیادہ دیر تک اپنی ان حرکتوں کو جاری نہ رکھ سکو گے۔" آصف تنفّر آمیز انداز میں بولا۔

"مُستقبل کی تو میں جوتے کی نوک کے برابر بھی پرواہ نہیں کرتا۔ مُجھے تو آج سو روپیوں کی ضرورت ہے۔"

"تم مُجھ سے اب ایک پائی بھی نہیں لے سکتے۔" آصف بگڑ کر بولا۔

"عجیب احمق آدمی ہو۔ یہاں شور مت مچاؤ۔ چلو کسی ریستوران میں بیٹھ کر معاملہ طے کرلیں گے۔" انور نے شرارت آمیز مُسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

انور، آصف اور رشیدہ ایک ریستوران میں آبیٹھے۔

"تو تم دوپہر کا کھانا کھا ہی چکے ہوگے۔" انور شرارت آمیز لہجے میں بولا۔

آصف نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن وہ اسے غصّہ بھری نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

"خیر چائے تو پیو گے۔" انور نے کہا اور بیرے کو بُلا کر کھانے اور چائے کا آرڈر دیا۔

"جانتے ہو مُجھے تمہاری ڈائری کہاں سے ملی تھی۔" آصف نے کہا۔

”جانتاہوں کہ تم کوئی حیرت انگیز جھوٹ بولنے والے ہو۔“ انور نے کہا۔

”جھوٹ۔۔۔!“ آصف اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”نہیں بھئی سچ۔۔۔!“ انور اُکتا کر بولا۔ ”کُچھ کہو گے بھی۔“

”جھریالی کے سنسان علاقے میں رات ایک کار میں آگ لگ گئی۔“ آصف اُسے تیز نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

”ارے۔۔۔!“ انور چونک کر بولا۔ "اچھّا اب میں اپنی ڈائری کو منع کر دوں گا۔ اس قسم کی حرکتیں نہ کیا کرے۔“

”انور۔۔۔!“ آصف کے لہجے میں سختی آگئی۔

انور سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کار کو راستے میں رسّی حائل کر کے روکا گیا تھا اور پھر اسے توڑ پھوڑ کر اس میں آگ لگادی گئی۔“

”لیکن پھر میں کیا کروں۔“ انور بولا۔

”اور اُس جلی ہوئی کار میں ایک لاش۔۔۔!“

”لاش۔۔۔!“ انور چونک کر بولا۔

”ہاں! اور موٹر کے قریب تمہاری ڈائری پڑی پائی گئی ہے۔“

انور ہنسنے لگا اور رشیدہ فکر آمیز انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ بھلا یہ بھی کوئی ہنسنے کا موقعہ تھا۔ ایسی حالت میں تو انور کو ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو جانا چاہیے تھا۔ رشیدہ سوچنے لگی کہ آخر انور نے اُس لاش کے متعلّق کیوں نہیں بتایا تھا اور سچ مچ یہ بڑی اُلجھن کی بات ہو گئی کہ وہیں پر انور کی ڈائری بھی پائی گئی۔

”اور کُچھ۔۔۔!“ انور معنی خیز انداز میں مُسکراتا ہوا بولا۔ ”میری پتلون کا پائنچہ اور جوتے کا سول بھی وہیں ملا ہو گا۔“

”مُجھے تمہیں حراست میں لینا پڑے گا۔“ آصف بُرا سامنہ بنا کر بولا۔

"تمہارے انداز سے سچ مچ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم نے یہ ساری باتیں انتہائی سنجیدگی سے کی ہوں۔" انور نے کہا۔

آصف اُسے قہر بھری نگاہوں سے گھورنے لگا۔

"اگر تم واقعی یہ سب کُچھ سنجیدگی سے کہہ رہے ہو تو پھر وہاں میری ڈائری کا پایا جانا سچ مچ حیرت انگیز ہے۔" انور کُچھ سوچتا ہوا بولا۔

"ڈائری خودبخود تو وہاں پہنچ نہیں سکتی۔" آصف تلخ لہجے میں بولا۔

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔" انور آہستہ سے بولا۔ "تو میرا خیال ہے کہ میری ڈائری رات ہی کو کسی نے گھر سے غائب کر دی تھی۔ میں آج صُبح اسے تلاش کر رہا تھا۔"

"تو گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کوئی تمہیں پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔" آصف نے کہا۔

"اس کے علاوہ میں اور سوچ ہی کیا سکتا ہوں۔"

”کوئی مجرم آسانی سے اقبالِ جرم نہیں کرلیتا۔“

”مجرم۔۔۔!“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”انور کو اتنی آسانی سے مجرم بنا دینا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ انسپکٹر صاحب۔“

”میں سچ کہتا ہوں کہ اس بار تمہاری دھمکیاں کارگر نہ ہو سکیں گی۔“ آصف نے کہا۔ ”مُجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تمہاری شرارت پسند طبیعت کے باوجود بھی مُجھے تم سے اُنس تھا۔ مگر اس بار میں مجبور ہوں۔“

انور نے ایک طنز میں ڈوبا ہوا قہقہہ لگایا۔

آصف دانت پیس رہا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اسے خود ہی پھانسی دے دیتا۔

”لاؤ وہ ڈائری مُجھے واپس کر دو۔“ آصف کڑوے لہجے میں بولا۔

”کیسی ڈائری۔۔۔ کونسی ڈائری؟ خواب تو نہیں دیکھ رہے ہو۔“ انور نے سنجیدگی سے کہا۔

”ان سب باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ اس کا اندراج کاغذات میں ہو چکا ہے۔“

”ہوا میں اُڑ رہے ہو شاید۔۔۔!“ انور مُسکرا کر بولا۔

”اب مُجھے سختی کرنی پڑے گی۔“ آصف جھنجھلا کر بولا۔

”میں پولیس والوں سے ہاتھاپائی کرنے کو کمینہ پن سمجھتا ہوں۔“ انور نے سنجیدگی سے کہا۔

”اگر تم سیدھی طرح نہ دو گے تو میں یہیں سب کے سامنے تمہاری جامہ تلاشی لوں گا۔“ آصف بولا۔

”شوق سے۔“ انور نے مُسکرا کر کہا۔ ”میں سرکاری آدمیوں کے کام میں حرج ہونے کو جرم سمجھتا ہوں۔“

”انور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ آصف نے اس کی جامہ تلاشی لی اور نڈھال ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر ندامت، غصّے اور نفرت نے عجیب طرح کے آثار پیدا کر دیے تھے۔“

"بس۔۔۔!" انور اُسے گھورتا ہوا بولا۔ "تم نے بھرے مجمعے میں خواہ مخواہ میری توہین کی ہے۔ اسے اچھّی طرح یاد رکھنا۔"

"میں کہتا ہوں ڈائری۔۔۔!"

"ڈائری نہیں ڈیری۔ روزانہ تازہ اور خالص دودھ پیا کرو۔ اس سے دماغی توازن درست رہتا ہے۔" انور نے سنجیدگی سے کہا۔

"بے کار۔۔۔ فضول۔۔۔ تُم بچ نہیں سکوگے۔" آصف بے بسی سے بولا۔

"تم جیسا احسان فراموش بھی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ تمہارے لیے میں نے کتنے پاپڑ بیلے ہیں۔" انور نے کہا۔

وہ اپنی جگہ پر۔۔۔ اس وقت میں فرائض کی انجام دہی پر مجبور ہوں۔

"تو میں نے تمھیں کب روکا ہے۔ تم شوق سے مُجھے گرفتار کر سکتے ہو۔ مگر میرا جرم۔۔۔!"

”قتل اور آتش زنی۔۔۔!“ آصف اُسے گھورتا ہوا بولا۔

”یعنی میں نے ایک آدمی کو قتل کر کے اس کی کار میں آگ لگا دی۔“

”اب یہ مُجھ سے پوچھ رہے ہو۔“ آصف بیزاری سے بولا۔

”اور پھر میں اس لیے وہاں اپنی ڈائری چھوڑ آیا کہ مرنے والا تنہائی کا احساس کم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ کرے۔“

”نہیں وہ جلدی اور گھبراہٹ میں تمہاری جیب سے گر گئی تھی۔“

”خیر۔۔۔ خیر۔۔۔ اس بے چارے کی لاش تو جل بھُن گئی ہو گی۔ شاید صورت بھی نہ پہچانی جاسکے۔“ انور نے کہا۔

”نہیں یہی تو حیرت کی بات ہے کہ اس کے کپڑے تک نہیں جلے۔“ آصف جلدی سے بولا۔

انور نے قہقہہ لگایا اور حقارت آمیز انداز میں آصف کی طرف دیکھنے لگا۔

آصف پھر اس کی حرکت پر جھنجھلا اٹھا۔

"تو بہر حال یہ انور کی حرکت ہے۔" انور نے کہا۔

"قطعی۔۔۔!" آصف خود اعتمادی کے ساتھ سر ہلا کر بولا۔

"بھلا میں نے اُسے قتل کس طرح کیا اور کار میں آگ لگانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ جب کہ لاش ہی نہ جل سکی۔ آگ لگانے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ لاش پہچانی نہ جا سکے۔ لیکن تم کہتے ہو کہ مقتول کے کپڑے تک نہیں جلے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ کار کے جل جانے کے بعد لاش اس میں ڈالی گئی۔"

"تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو۔" آصف نے کہا۔

"یہی کہ تم خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ کر اپنا وقت برباد کرو گے۔"

"یہ تمہارا اپنا خیال ہے۔" آصف بیزاری سے ہونٹ سکوڑ کر بولا۔

انور اور رشیدہ کھانا کھا چکے تھے۔ اس کے بعد چائے کا دور شروع ہوا جس میں

طوعاً و کرہاً آصف کو بھی شریک ہونا پڑا۔

"لاش کس کی ہے۔" انور نے پوچھا۔

"یہ تم مُجھ سے بہتر جان سکتے ہو۔" آصف نے کہا۔

"آپ کیوں خواہ مخواہ انور کو پھانسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" رشیدہ جھلّا کر بولی۔

"تم انور کو اتنا شریف کیوں سمجھتی ہو۔" آصف مُسکرا کر بولا۔

"اس لیے کہ وہ شریفوں کا بخیہ ادھیڑ تا رہتا ہے۔" رشیدہ منہ بنا کر بولی۔

"تم مت بولو بھئی۔" انور رشیدہ کو پیار بھری آنکھوں سے دیکھتا ہوا بولا۔ پھر آصف کو مخاطب کر کے کہا۔ "آخر وہ آدمی ہے کون۔"

آصف نے ایک تصویر نکال کر میز پر ڈال دی۔ انور کو اگر اپنی طبیعت پر قابو نہ ہوتا تو وہ شدّت سے چونک پڑا ہوتا۔ رشیدہ بھی انور کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ

دیکھ کر سنبھل گئی۔ اُسے آصف کے سر کے بل کھڑے ہو جانے پر اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی کہ اس تصویر کو دیکھ کر ہوئی۔

"مُجھے افسوس ہے کہ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" انور نے کہا۔

"وہ تو تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔" آصف نے تصویر کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"میں پھر کہتا ہوں کہ ڈائری مُجھے واپس دے دو۔ ورنہ اچھّا نہ ہو گا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" انور جھلّا کر بولا۔ "جامہ تلاشی لے چکنے پر بھی تمہاری تشفی نہیں ہوئی۔"

"خیر خیر۔" آصف اٹھتا ہوا بولا۔ "تمہیں جلد ہی اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔"

انور کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ ریستوران سے چلا گیا۔

رشیدہ حیرت سے انور کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کُچھ کہنا چاہتی تھی کہ انور نے آنکھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔

پھر وہ دونوں ریستوران سے نکل کر آفس کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے بھر خاموشی رہی۔ انور محسوس کر رہا تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔

آفس پہنچ کر اس نے رشیدہ کو اپنے کمرے میں چلنے کے لیے کہا۔ رشیدہ بہت زیادہ بے چین نظر آ رہی تھی۔

"وہ تصویر۔۔۔ یعنی۔۔۔ کہ وہ۔۔۔!" رشیدہ اٹک اٹک کر بولی۔

"اسی آدمی کی تھی جو کل رات کو مُجھ سے ملنے آیا تھا۔" انور نے جملہ پورا کر دیا۔

"اور وہی میری ڈائری بھی لے گیا تھا۔"

"اور ڈائری کیا ہوئی۔"

"وہ میں نے اُسی وقت ایک زمین دوز گندے نالے میں ڈال دی تھی جب آصف

کے ساتھ ریستوران جا رہے تھے۔" انور بولا۔

"ارے۔۔۔!"

"ہاں اور اب تک پانی کے بہاؤ نے اس کے پرخچے اُڑا دیے ہوں۔"

اسٹیج کی واردات

"سنو انور۔۔۔!" رشیدہ سنجیدگی سے بولی۔ "مُجھے ایسی زندگی سے پیار ضرور ہے لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ ہم لوگ قانون کی نظروں میں مجرم بنیں۔"

"وہ تو زبردستی بننا پڑا۔ بھلا اس میں میرا کیا قصور۔۔۔!"

"تم سب کُچھ آصف کو بتا کیوں نہیں دیتے۔"

"عورت ہمیشہ عورت ہی رہے گی۔ خواہ وہ کتنی ہی ترقّی کیوں نہ کر جائے۔ جانتی ہو کہ اِس کا کیا انجام ہو گا۔ وہ مُستقل طور پر میرے پیچھے پڑ جائے گا۔ لیکن رشیدہ

میں نے تمھیں کبھی اس بات پر مجبور نہیں کیا کہ تم ہر معاملے میں میرا ساتھ دیا کرو۔"

"تم غَلَط سمجھے ہو۔ تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہی تھی۔"

"میں اپنی بھلائی کو عرصہ ہوا دفن کر چکا ہوں۔" انور سنجیدگی سے بولا۔ "میں مریضوں کی طرح زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ دُنیا کی بہتی ہوئی دولت میں میرا بھی حصّہ ہے۔"

رشیدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے انور کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ "میں سمجھتا ہوں کہ تُم زندگی کی یکسانیت سے اُکتا گئی ہو۔ تمہارا عورت پَن جاگ اُٹھا ہے۔"

"اپنی جنس کی فطرت کے مطابق تمہیں زندگی میں ہر لحظہ تبدیلی بھی چاہیے اور سکون بھی۔ میں اچھّی طرح جانتا ہوں کہ تم اپنی پچھلی زندگی کی یکسانیت سے اُکتا کر میری طرف بھٹک آئیں تھیں اور اب پھر اس زندگی میں لوٹ جانا چاہتی ہو۔

مجھے ذرّہ برابر بھی اس کا افسوس نہ ہو گا۔"

"تم نہ جانے کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔" رشیدہ نے منہ بنا کر کہا۔

"میں وہی کہہ رہا ہوں جو تمہارے دِل میں ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے اور رہیں گے لیکن اب ہم دونوں کی راہیں مختلف ہو جانی چاہئیں۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچے۔"

"میں نہیں سمجھی۔"

"داراب بہت اوچھی طبیعت کا آدمی معلوم ہو تا ہے۔" انور نے کہا۔ "بہر حال اس سے بھڑنا بھی پڑے گا۔"

"تو میں نے تم سے مشورہ کب مانگا ہے۔"

"جو میں کہوں گی تمہیں وہی کرنا پڑے گا۔" رشیدہ تیز لہجے میں بولی۔

"فضول بکواس نہیں، جاؤ اپنا کام کرو۔"

"اگر تم نے میرا کہنا نہ مانا تو۔۔۔!"

"تم مُجھ سے شادی کر لو گی۔" انور نے جملہ پورا کر دیا۔

رشیدہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگی۔

"میں آصف کو سب کُچھ بتا دوں گی۔"

"بتا دو۔۔۔!" میں اُسے ایک بُوڑھا بچّہ سمجھتا ہوں۔ "اگر میں ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوا ہوتا تو میری پہلی اولاد آصف ہی کے برابر ہوتی۔"

"دیکھو اس سِلسِلے کو مذاق میں مت ڈالو۔" رشیدہ نے کہا۔

"تم یہاں سے جاتی ہو یا کان پکڑ کر نکال دوں۔"

"دیکھو انور میں کسی دِن تمہاری کھال اُتار دوں گی۔" رشیدہ نے کہا اور پیر پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔

انور دوسرے دِن کے اخبار کے لیے اپنی رپورٹیں مکمل کرنے لگا۔ رات والے حادثے کو اس نے آصف کے بیان کے مطابق لکھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک چپڑاسی اندر آکر اس کی میز پر ایک لفافہ رکھ گیا۔ انور لکھنے میں مشغول تھا۔ کام ختم کرنے کے بعد اس نے لفافہ اٹھا کر کھولا۔۔۔ اس میں پلازا تھیٹر کے آرکسٹرا کے دو ٹکٹ تھے۔ انور کو رات والے پُراسرار اجنبی کی دعوت یاد آگئی۔ اس نے اُسے آج پلازا تھیٹر کے شو کی دعوت دی تھی۔ مگر آصف کے بیان کے مطابق وہ قتل کر دیا گیا تھا۔ پھر یہ کیا معمّہ ہے۔

انور نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو اندر بلایا۔

”یہ لفافہ کون لایا تھا۔“

”میں انہیں پہچانتا نہیں۔“

”کوئی قاعدے کا آدمی تھا۔“

”جی ہاں ایک بہت نفیس کار پر آئے تھے۔“

”حلیہ کیا تھا۔“

”سیاہ داڑھی۔ رنگ گورا ناک کے نتھنے کے پاس بڑا سا اُبھرا ہوا تِل تھا۔ سرمئی رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھے۔“

”ہوں۔۔۔!“ انور نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔

چپڑاسی نے جو حلیہ بتایا تھا وہ اسی آدمی کا تھا جس کی تصویر آصف نے اسے دِکھائی تھی اور جو پچھلی رات کو انور سے اس کے گھر پر ملا تھا۔ انور سوچتا رہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس کے چہرے پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ چار بج رہے تھے۔ اس نے سب کاغذات ایڈیٹر کے کمرے میں بھجوا دیئے اور خود اپنے کمرے سے نکل آیا۔ دوسرے کمرے میں رشیدہ بیٹھی ٹائپ کر رہی تھی۔ وہ اس کی پشت پر جھک گیا۔

”اب ختم بھی کرو یہ سِلسِلہ، کیا گھر نہیں چلنا ہے۔“ انور نے آہستہ سے کہا۔

”نہیں میرا راستہ الگ ہے۔“ رشیدہ نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"یعنی آج دوسرے راستے سے گھر جاؤ گی۔"

"تُم سے مطلب۔۔۔!"

"نہیں مُجھ سے کوئی مطلب نہیں۔" انور مُنہ سکوڑ کر بولا۔ "میں تو اِس لیے کہہ رہا تھا کہ تمہیں خواہ مخواہ کوئی سواری کرنی پڑے گی۔"

اور پھر انور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر آفس سے چلا آیا۔ اپنی موٹر سائیکل نکالی اور سیدھا کوتوالی کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن اُسے اس بات پر حیرت ہوئی کہ کوتوالی میں کسی نے اس کی طرف خاص توجّہ نہ دی۔

آصف کوتوالی ہی میں موجود تھا۔ انور کو دیکھتے ہی جھلّا گیا۔

"کیوں! یہاں کیوں آئے ہو۔"

"تمہیں مُجھ سے یہ پوچھنے کا حق نہیں، میں ایک اخبار کا کرائم رپورٹر ہوں اور اُس کے لیے باقاعدہ لائسنس رکھتا ہوں۔" انور مُسکرا کر بولا۔

"بہت اچھّا! یہاں یہ مشورہ ہی ہو رہا تھا کہ تمہیں شُبہے میں گرفتار کر لیا جائے۔"
آصف نے کہا۔

"میں گرفتار ہی ہونے کے لیے آیا ہوں۔" انور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں ذرا وہ صورتیں دیکھنا چاہتا ہوں جو میری گرفتاری کے متعلّق مشورہ کر رہی تھیں۔"

"دیکھو برخوردار یہ انگلینڈ کی پولیس نہیں ہے۔ یہاں اقبالِ جرم کرانے کا جو طریقہ برتا جاتا ہے اس سے تم واقف ہو۔" آصف نے کہا۔

"میں اچھّی طرح جانتا ہوں آصف صاحب! ذرا وہ طریقہ اختیار کر کے دیکھیے۔"

"صاحب زادے ہو۔" آصف مُسکرا کر بولا۔ "یہ کہو میں نے اس ڈائری کو اپنے ہی تک محدود رکھا تھا ورنہ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔"

"تم نے یہ کہہ کر میرا دل جیت لیا میرے پیارے محبوب۔" انور رومانٹک انداز میں بولا۔

آصف نے نفرت سے مُنہ پھیر لیا اور انور کے ہونٹوں پر شرارت آمیز

مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"پلازا تھیٹر چل رہے ہو۔" انور نے پوچھا۔

دفعتاً آصف چونک پڑا۔

"کیا مطلب! تمہیں کیسے معلوم ہوا۔" آصف اسے تحیّر آمیز نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ انور سوچ میں پڑ گیا کہ آصف کے اس رویّے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔

"دُنیا کی کونسی ایسی بات ہو سکتی ہے جس سے مُجھے واقفیت نہ ہو۔"

آصف اُسے گھورنے لگا۔

"پلازا کے منیجر سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ٹکٹ اس نے نہیں بھیجے۔ لیکن وہ آج ہی خریدے گئے ہیں۔" آصف کُچھ سوچتا ہوا بولا۔

"صرف تمہارے ہی پاس آئے ہیں۔" انور نے پوچھا۔

"نہیں دو تین افسروں کو بھی کسی نے آج کے شو کے لیے مدعو کیا ہے۔" آصف

بولا۔

"تمہیں اس کی اِطّلاع کس طرح ہوئی۔"

"ایک کرائم رپورٹر کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کی اطلاعات بہم پہنچاتا رہے۔"

آصف کُچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

"سچ بتاؤ تمہاری ڈائری وہاں کس طرح پہنچی تھی۔" آصف نے کہا۔ "میں تم سے اس قسم کے جُرم کی توقع نہیں رکھتا۔"

"اب آئے سیدھی راہ پر۔۔۔!" انور ہنس کر بولا۔ "کوئی مُجھے پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس شہر میں کوئی بڑی واردات ہونے والی ہے۔۔۔ بہت بڑی۔۔۔ اسے لکھ لو۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب! بہت جلد واضح ہو جائے گا۔" انور نے کہا۔ "لاش کے متعلّق معلوم ہوا

ہے کہ کس کی ہے۔"

"نہیں اور ایک دلچسپ اِطّلاع۔ اس کی داڑھی نقلی ثابت ہوئی۔"

انور نے قہقہہ لگایا اور شرارت آمیز نظروں سے آصف کی طرف دیکھنے لگا۔

"تمہارے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ تم اس کے متعلّق کُچھ نہ کُچھ ضرور جانتے ہو۔"

"بھلا میں کیا جان سکتا ہوں۔" انور نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم شیطان ہو۔" آصف بزرگانہ شفقت کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

"بے کار! بالکل بے کار! اس قسم کے پیار بھرے حربے میرے لیے قطعی بیکار ہیں۔ اگر میں کُچھ جانتا ہوتا تو ویسے ہی بتا دیتا۔"

"خیر خیر۔۔۔!" آصف مُسکراتا ہوا بولا۔ "تُم تو میرے ساتھ پلازا چل رہے ہو۔"

"تمہارے ساتھ کیوں! کیا میں اس شہر کی اہم شخصیت نہیں ہوں۔"

"کیا مطلب۔۔۔!" آصف چونک کر بولا۔

"ظاہر ہے کہ مدعو کرنے والے نے مُجھے مدعو کیا ہو گا۔" انور لاپروائی سے بولا۔

"اور تم مدعو کرنے والے کو نہیں جانتے۔" آصف نے پوچھا۔

"جب یہاں کا اتنا بڑا سُراغ رساں نہیں جانتا تو بھلا میں بے چارہ کیا جان سکتا ہوں۔" انور طنزیہ انداز میں بولا۔

"انور تم بعض اوقات سخت تکلیف دہ ہو جاتے ہو۔"

انور ہنسنے لگا اور آصف اُسے برآمدے میں چھوڑ کر دفتر میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد انور کی موٹر سائیکل پلازا تھیٹر کی طرف جا رہی تھی۔ ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ ڈرامہ شروع ہونے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا لیکن بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ کمپاؤنڈ میں شانے سے شانہ چھل رہا تھا۔ اس دوران میں جب کہ فلم اتنی مقبولیت

حاصل کر چکا ہے۔ اسٹیج کی کوئی اہمیّت نہیں رہ گئی، لیکن پھر بھی پلازا تھیٹر کا ہال تماشائیوں سے بھرا رہتا تھا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ ایک رقاصہ شیلا رانی تھی۔ حال ہی میں وہ فرانس، جرمنی، انگلینڈ اور اطالیہ میں اپنے فن کے مظاہرے کر کے واپس آئی تھی۔ دورے کے درمیان میں اس نے غیر ملکی طرزِ رقص سے بھی خاصا استفادہ کیا تھا اور اس طرح اس کے آرٹ کو ایک نئی زندگی بخش دی تھی۔ حالانکہ ہمارے ملک میں فن کے پرکھنے والے کم ہیں لیکن شیلا رانی جوان بھی تھی اور پھر کیا چاہیے اس کے جسم کا لوچ ہی لوگوں کو اسی طرف متوجّہ کر لینے کے لیے کافی تھا۔

انور ہال میں جا کر بیٹھ گیا۔ آرکسٹرا کی چند نشستوں کے علاوہ سارا ہال بھرا ہوا تھا۔ انور نے سوچا کہ یہ خالی جگہیں وہی مخصوص نشستیں ہو سکتی ہیں جن کے ٹکٹ کسی نامعلوم آدمی نے پولیس کے چند آفیسروں کے پاس بھجوائے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد انسپکٹر آصف چار دوسرے پولیس آفیسروں کے ساتھ ہال میں داخل ہوا۔ انور کی سیٹ کے بعد پانچ نشستیں خالی تھیں۔۔۔ وہ پانچوں آ کر

بیٹھ گئے۔ آصف انور کے برابر ہی بیٹھا۔

"تو کیاواقعی تمہیں بھی ٹکٹ موصول ہوا تھا۔" آصف نے پوچھا۔

"شاید تم اب مُجھ سے حلف اُٹھوانا چاہتے ہو۔" انور نے کہا۔ "مُجھے دو ٹکٹ موصول ہوئے تھے اسی لیے میرے برابر کی سیٹ ابھی تک خالی ہے۔"

"دو ٹکٹ کیوں۔"

"شائد ایک رشیدہ کے لیے تھا۔"

"تو اسے کیوں نہیں لائے۔"

"وہ خود نہیں آئی۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہال آرکسٹرا کی دھنوں سے گونجنے لگا۔ہال کی روشنی گل ہو گئی اور اسٹیج جگمگانے لگا۔ پردہ اٹھااور ڈرامہ شروع ہو گیا۔ڈرامہ زیادہ دلچسپ نہ تھا۔

”بھئی یہاں تو کوئی خاص بات نہیں۔۔۔“ آخر آصف کُچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”افسوس کیوں کر رہے ہو۔ مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے۔“ انور مُسکرا کر بولا۔

سین پر سین بدلتے رہے۔ آخر کار وہ موقع آیا جب ڈرامے کی ہیروئن شیلا رانی اپنے پائیں باغ میں رقص کر رہی تھی۔ قریب ہی سے سٹیج پر ایک ڈاکو نمودار ہوا جس نے اپنا چہرہ سیاہ نقاب سے چھپا رکھا تھا۔ ہیروئن اس کی آمد سے بے خبر تھی۔ وہ اپنے فن میں ڈوبی ہوئی رقص کرتی رہی۔ دفعتاً ڈاکو نے جیب سے پستول نکالا ایک زوردار دھماکہ ہوا اور ہیروئن چیخ مار کر گر پڑی۔ پردہ کھینچ دیا گیا۔

”کتنی سچّی اداکاری تھی۔ کتنی سچّی چیخ۔“ آصف بولا۔

”اداکاری نہیں حقیقت۔“ انور تیزی سے اٹھتا ہوا بولا۔ ”وہ سچ مچ ختم ہو گئی ہے۔“ اور پھر پردے کے پیچھے شور مچ گیا انور اسٹیج کی طرف جھپٹا۔

”ارے ارے کیا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ آصف چیخا۔

”جلدی آؤ۔۔۔ جلدی آؤ۔۔۔!“ انور ہاتھ ہلاتا ہوا بولا۔ دوسرے لمحے میں وہ

اسٹیج پر تھا۔ شیلا رانی اسٹیج پر مُردہ پڑی تھی اور چند ایکٹر اس کے گرد کھڑے بُری طرح چیخ رہے تھے۔ ان میں وہ ڈاکو بھی تھا اس کے ہاتھ میں ابھی تک پستول دبا ہوا تھا۔ گولی شیلا رانی کے سر پر لگی تھی۔

انور نے پلٹ کر دیکھا آصف بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسٹیج پر آگیا تھا اور حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"جلدی کرو۔" انور بولا۔ "کوئی باہر نکل کر نہ جانے پائے۔"

آصف پردے کے باہر آگیا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ شور مچا رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یک بیک یہ کیسی بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔

"حضرات۔۔۔!" آصف تماشائیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میں محکمہ سُراغ رسانی کا انسپکٹر آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ میں سے کوئی ہال کے باہر نہ جائے رقاصہ سچ مچ قتل ہوگئی ہے۔"

تماشائیوں میں ہیجان پھیل گیا۔ تھوڑی دیر بعد سب دروازے مقفّل کر دیے

گئے۔ آصف پھر اسٹیج پر لوٹ آیا۔ پستول چلانے والا سر پکڑے بیٹھا تھا اور اس کا پستول انور کے ہاتھ میں تھا۔

"آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔" ریوالور والا دوسرے ایکٹروں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"میں یہاں سے ہٹ کر کہیں نہیں گیا۔"

"ایکٹروں نے اس کے بیان کی تائید کی۔"

"عجیب بات ہے۔" انور سر ہلا کر بولا۔ "پولیس آفیسروں نے ریوالور والے کو اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ پستول خالی تھا۔" منیجر نے آگے بڑھ کر کہا۔ "عین موقعے پر یہ معلوم ہوا تھا کہ بغیر گولیوں والے کارتوس ختم ہو گئے۔ اس لیے مجبوراً یہ انتظام کیا گیا تھا کہ جیسے ہی ریوالور نکالے پردے کے پیچھے پٹاخا داغ کر پستول کی مصنوعی آواز پیدا کی جائے۔ آپ نے خود دیکھا ہو گا کہ ریوالور سے دھواں یا

شعلہ نہیں نکلا تھا۔"

"تو پھر یہ گولی آئی کہاں سے۔" آصف نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

"اب بھلا بتایئے میں کیا بتاؤں۔" منیجر نے کہا۔ "کیا میں یہ نہیں جانتا کہ یہ حادثہ میرے لیے ایک بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد تھیٹر کا ایک ایک کونہ دیکھ ڈالا گیا لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ گولی کہاں سے آئی اور وہ کس کی حرکت تھی۔ آخر کار تھک ہار کر ہال کے دروازے کھلوا دینے پڑے۔ منیجر بُری طرح بدحواس تھا۔

"اب کیا کیا جائے۔" آصف بے بسی سے بولا۔

"مدعو کرنے والا دراصل ہماری بے بسی کا تماشہ دیکھنا چاہتا تھا۔" انور نے کہا۔

"تو کیا۔۔۔ تو کیا۔۔۔!"

"جی ہاں۔۔۔!" انور طنزیہ لہجے میں بولا۔ "کبھی پہلے بھی اس قسم کے پراسرار

دعوت نامے موصول ہوئے تھے۔"

آصف غور سے اُسے دیکھنے لگا۔

انور نے پستول کی نال کو ناک سے لگا کر سونگھا۔

"اس پستول سے تو واقعی گولی نہیں چلی۔" انور نے کہا۔

"مُمکن ہے بدل دیا گیا ہو۔" آصف بولا۔

"دوسرے لوگوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اسٹیج سے نہیں ہٹا۔" انور نے کہا۔

"پھر۔۔۔!"

"بھلا میں کیا جانوں۔" انور منہ بنا کر بولا۔

تھوڑی دیر بعد ہال میں پولیس والوں کے علاوہ کوئی اور نہ رہ گیا۔ حادثے کی اِطّلاع پا کر کُچھ اور ذمّے دار آفیسر بھی پہنچ گئے تھے۔ وہ ایکٹر جو ڈاکو کا پارٹ کر

رہا تھا حراست میں لے لیا گیا تھا۔

اس وقت اسٹیج پر جو ایکٹر اور پردہ کھینچنے والے موجود تھے پولیس نے ان کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔

پولیس والے لوگوں کے بیانات لینے میں اُلجھے ہوئے تھے اور انور کسی اور ہی فکر میں تھا۔ اس کی نگاہیں پورے اسٹیج کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس سین کے لیے خاص طور سے اسٹیج ترتیب دیا گیا تھا۔ داہنی طرف لکڑی کی ایک دیوار میں اس طرح رنگ کاری کی گئی تھی کہ وہ کسی کوٹھی کے سامنے کا حصّہ معلوم ہو رہا تھا اوپر ایک سائبان بنا ہوا تھا جسے نیچے سے روکنے کے لیے لوہے کے کئی چھڑ لگائے گئے تھے۔ شیلا رانی ٹھیک اسی سائبان کے سامنے ناچ رہی تھی۔ انور اس کی جگہ جا کر کھڑا ہو گیا جہاں سے ابھی ابھی شیلا رانی کی لاش ہٹائی گئی تھی۔ اس کی نگاہیں بار بار سامنے والے سائبان کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

”تو تمہیں اس حادثے کی اطلاع پہلے سے تھی۔“ آصف نے انور سے پوچھا۔

”تم عجیب آدمی ہو۔“ انور چڑ کر بولا۔ ”اپنا کام کرو۔ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے۔“

”تمہیں بتانا پڑے گا۔“

”کیا بتانا پڑے گا۔“

”ہم لوگوں کے پاس ٹکٹ کس نے بھجوائے تھے۔“ آصف تیز لہجے میں بولا۔

”افراسیاب والی طلسمِ ہوش رُبا نے۔“

”ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔“ آصف دانت پیس کر بولا۔

”تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔“ انور نے کہا۔

”اب مجبوراً مُجھے سر پھوڑ لینا پڑے گا۔“ انور نے مُسکرا کر جملہ پورا کر دیا۔ ”تُم آدمی ہو یا ڈیوٹ۔۔۔!“

”ٹھہرو بتاتا ہوں۔“ آصف غصّے میں پولیس آفیسروں کی طرف مُڑتا ہوا بولا۔

”تمہاری مرضی۔۔۔!“ انور نے لاپروائی سے اپنے شانوں کو جنبش دیتے ہوئے

کہا۔ ”کل ہی تمہارے خلاف چار سو درخواستیں گزر جائیں گی۔“

آصف رُک کر اُسے گھورنے لگا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ انور کی بوٹیاں اڑا دیتا۔

”اِس سائبان کی طرف دیکھ رہے ہو۔“ انور آہستہ سے بولا۔ ”اِسے تُڑوا دو اور پھر کل کے اخبارات تمہاری شان میں لمبے چوڑے قصیدے چھاپ دیں گے۔ اچھّا شب بخیر۔ میں چلا۔ اگر مناسب سمجھنا تو نتیجے سے بھی مطلع کر دینا۔۔۔ ورنہ میں تو اپنی رپورٹ مکمّل کر ہی لوں گا۔“

قتل کا راز

قبل اس کے کہ آصف کُچھ کہتا انور ہال سے نکل کر کمپاؤنڈ میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی موٹر سائیکل پر گھر کی طرف واپس جا رہا تھا۔ گیارہ بج چکے تھے۔ شہر قریب قریب ویران ہو چکا تھا۔ کہیں کہیں ایک آدھ دُکانیں کھلی نظر آ رہی تھیں۔

انور جیسے ہی اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ رشیدہ اس پر جھپٹ پڑی۔

"کہاں تھے۔۔۔ کہاں گئے تھے۔"

''تُم یہاں کیا کر رہی تھی۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔۔۔'' انور کوٹ اتار کر کرسی پر ڈالتا ہوا بولا۔

''نہیں جاؤں گی۔''

''اوہو۔۔۔ اور اگر میں نے کان پکڑ کر نکال دیا تو۔''

''میں تُم سے کمزور ہوں کیا۔'' رشیدہ بھنّا کر بولی۔

انور کوئی جواب دیئے بغیر آرام کرسی پر گر گیا۔ رشیدہ اسے گھور رہی تھی۔

''میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔'' وہ تھوڑی دیر بعد بولی۔

''تو میں نے کب کھایا ہے۔'' انور نے کہا۔ ''آخر تم میرا انتظار کیوں کرتی ہو۔''

''میری خوشی۔''

''دیکھو تمہارا راستہ اُدھر ہے۔'' انور دروازے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

دفعتاً دروازے میں ایک صورت دکھائی دی۔ ایسی صورت جسے دیکھ کر دونوں

چونک پڑے۔

یہ وہی تھا جو پچھلی رات کو انور سے ملا تھا اور جس کی تصویر آصف نے دِکھائی تھی۔ وہ اتنے پُر سکون طریقے سے کمرے میں داخل ہوا جیسے وہ اس کا اپنا ہی کمرہ ہو۔ قبل اس کے کہ انور کُچھ کہتا وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر مُسکرانے لگا۔

"تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" انور نے رشیدہ سے کہا۔ رشیدہ انور کو گھورتی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"جاؤ اپنے کمرے میں۔" انور نے پھر کہا۔

"بکو مت۔۔۔!" رشیدہ نے کہا اور اجنبی کو معنی خیز انداز میں دیکھنے لگی۔

"تُم کل رات میری ڈائری کیوں اٹھالے گئے تھے۔" انور نے اجنبی سے پوچھا۔

"تمہیں ایک معمولی سا سبق دینے کے لیے۔" اجنبی نے مُسکرا کر کہا۔

"دیکھو! خواہ مخواہ مُجھ سے اُلجھنے کی کوشش نہ کرو۔" انور نے کہا۔

"میں پھر یہی چاہوں گا کہ تم داراب سے سمجھوتہ کرلو۔"

"کس بات کا سمجھوتہ۔"

"یہی کہ تم اس کے معاملات میں دخل نہ دوگے۔" اجنبی نے کہا۔

"اب یہ چیز میرے امکان سے باہر ہوگئی ہے۔" انور نے کہا۔ "اگر تُم نے میری ڈائری چرا کر مُجھے پھنسوانے کی کوشش نہ کی ہوتی تو شاید اس کی ضرورت ہی نہ سمجھتا۔"

"دیکھو انور! تمہیں داراب سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑے گا۔ کیا تم نے اس وقت تھیٹر میں رقاصہ کی موت نہیں دیکھی۔"

انور خاموشی سے اسے گھور رہا تھا۔ رشیدہ اٹھ کر کمرے سے جانے لگی۔

"آپ یہیں تشریف رکھیے محترمہ۔۔۔!" اجنبی بولا۔

"کیوں۔۔۔؟" رشیدہ اسے قہر آلود نظروں سے گھورتی ہوئی بولی۔

”میں آپ سے استدعا کرتا ہوں۔“ اجنبی مُسکرا کر بولا۔

”میں پولیس کو فون کروں گی۔“

”نہیں۔۔۔!“ انور اسے تیز نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔ ”چپ چاپ اپنے کمرے میں سو جاؤ۔“

رشیدہ پھر بیٹھ گئی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ انور نے اجنبی سے پوچھا۔

”میرا نام دو سو تیرہ ہے۔“ اجنبی مُسکرا کر بولا۔

”اوہ تو مُجھ پر اپنے گروہ کا رُعب ڈالنا چاہتے ہو۔ یعنی تم اپنے گروہ کے دو سو تیرھویں ممبر ہو۔“

”یہی سمجھ لو۔“

”تم نے کل ایک آدمی کو قتل کر کے اس کی شکل اپنی جیسی بنادی تھی۔" انور نے

کہا۔ ”اور تم سمجھتے تھے کہ شاید میں اس وقت تمہیں دیکھ کر گھبرا جاؤں گا۔“

”نہیں نہیں محض یہ دِکھانا تھا کہ تم نے داراب کی طاقت کا غَلَط اندازہ لگایا ہے۔“
اجنبی بولا۔

”مردے گھسیٹنے والے گیدڑوں کو میں طاقتور نہیں سمجھتا۔“ انور نے منہ بنا کر کہا۔
”وہ شخص ہر گز بہادر نہیں ہو سکتا جو عورتوں کو قتل کرتا پھرے۔“

”دیکھو میں پھر تمہیں سمجھاتا ہوں۔“ اجنبی نے کہا۔

”میں کُچھ سمجھنے کے لیے تیّار نہیں۔“

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ہماری آخری گفتگو ہے۔“

”قطعی۔۔۔!“ انور نے کہا اور میز پر سے کتاب اٹھا کر اس کے ورق اُلٹنے لگا۔

”خیر۔۔۔۔!“ اجنبی اُٹھتا ہوا بولا۔ ”میں پھر تمہیں وقت دیتا ہوں۔“

انور نے کتاب میز پر پٹخ دی اور تن کر کھڑا ہو گیا وہ اس پُر اسرار اجنبی کو عجیب

نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"میں تُم سے کہتا ہوں کہ یہ میری اور تمہاری آخری ملاقات ہے۔" انور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"ضِد اچھّی نہیں ہوتی۔"

"تم جاسکتے ہو۔" انور نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

اجنبی اُسے گھورتا ہوا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"انور تم سنتی ہو رشیدہ۔" انور نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ "تُم بھی یہاں سے چلی جاؤ۔"

رشیدہ نے اُسے گھور کر دیکھا اور پیر پٹختی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ لیکن اُس کے جانے کے بعد ہی انور کو خیال آگیا کہ اس نے ابھی کھانا نہیں کھایا۔ وہ اٹھ کر رشیدہ کے کمرے کے سامنے آیا۔ رشیدہ دروازہ بند کر چکی تھی۔ انور آہستہ آہستہ

دستک دینے لگا۔

رشیدہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

"اب کیا ہے؟" وہ جھلّا کر بولی۔

"چلو کھانا کھائیں گے۔"

رشیدہ ہونٹ بھینچے اُسے گھور رہی تھی۔

"میری بلّی۔۔۔!" انور پیار بھرے لہجے میں بولا اور رشیدہ پگھل گئی۔

دونوں قریب ہی کے ایک ریستوران کی طرف روانہ ہو گئے۔

کھانے کے دوران میں رشیدہ اس اجنبی کا تذکرہ چھیڑ بیٹھی۔ انور نے اسے پلازا تھیٹر کے حادثے کے متعلّق بتایا۔ رشیدہ تحیّر آمیز انداز میں انور کی طرف دیکھنے لگی۔

"شیلا رانی کو داراب سے کیا تعلّق۔" رشیدہ تھوڑی دیر بعد بولی۔

”یہی تو دیکھنا ہے۔“ انور نے کہا۔

”شیلا رانی کون تھی۔“ دفعتاً رشیدہ نے کہا۔

”ایک رقاصہ۔۔۔!“ انور نے جواب دیا۔

”وہ تو تھی ہی لیکن کس خاندان سے تعلّق رکھتی تھی۔“

”یہ میں نہیں جانتا۔“

”میں جانتی ہوں۔“

”تو پھر پہیلیاں بجھوانے سے کیا فائدہ۔“ انور نے جھنجھلا کر کہا۔

”میں دراصل یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ مشہور کرائم رپورٹر کتنے پانی میں ہے۔“ رشیدہ نے ہنس کر کہا۔

انور اُسے گھورنے لگا۔ رشیدہ کی ہنسی میں اضافہ ہو گیا۔

”بس اب چپ بھی رہو ورنہ شوربے کی پلیٹ تمہارے منہ پر مار دوں گا۔“

رشیدہ اور زور سے ہنسنے لگی۔ انور ہاتھ سے نوالہ رکھ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”تو بھئی اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے۔“ رشیدہ سنجیدگی سے بولی۔ "کھاؤنا۔“

انور نے سگریٹ سلگا لی اس کے چہرے پر بیزاری پھیل گئی۔ رشیدہ کُچھ اور کہنے والی تھی کہ آصف دکھائی دیا۔

”اوہ تو تم یہاں ہو۔ میں واپس جا رہا تھا۔“

"اچھّا! اچھّا۔۔۔!“ انور اٹھتا ہوا بولا۔ ”وہیں چلو۔۔۔!“

رشیدہ بھی کھانا کھا چکی تھی۔ انور نے بل ادا کیا اور وہ فلیٹ کی طرف لوٹ آئے۔

”انور آخر تم مُجھے تنگ کیوں کر رہے ہو۔“ آصف نے کہا۔ اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

”بیٹھو۔۔۔ بیٹھو۔۔۔!“ انور بے صبری سے ہاتھ ہلاتا ہوا بولا۔

”تمہارا خیال بالکل صحیح نکلا۔ گولی اسی سائبان سے چلی تھی۔“ آصف نے کہا۔

"ان لوہے کی سلاخوں میں ایک رائفل کی نالی تھی۔" انور مُسکرا کر بولا۔

"ہاں اور منیجر اس دریافت پر قریب قریب بے ہوش ہو گیا تھا۔" آصف نے کہا۔
"رائفل کا کندہ اُس لکڑی کی موٹی سی دیوار کے اندر چھپا ہوا تھا اور نال دوسری طرف نکلی ہوئی تھی جس پر چند اور سلاخوں کے ساتھ سائبان ٹکا ہوا تھا۔ اسٹیج کے دوسرے حصّے میں سوراخ کر کے ایک پتلی سی ڈوری رائفل کی لمبی نال تک پہنچائی گئی تھی۔ رائفل بھری ہوئی تھی۔ جب شیلا رانی رائفل کی زد پر آ گئی تو کسی نامعلوم آدمی نے وہ ڈوری کھینچ لی اور رائفل چل گئی۔"

"اس دریافت کے بعد تم نے کیا کیا۔۔۔؟"

"منیجر کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔" آصف نے کہا۔

"اس ایکٹر کا کیا ہوا جس نے ڈاکو کی اداکاری کی تھی۔"

"وہ بھی حراست میں ہے اور وہ بھی جس نے اسٹیج کے پیچھے پٹاخا داغا تھا۔"

"اور ڈائریکٹر کا کیا ہوا۔" انور نے پوچھا۔

”وہ اس حادثے سے پہلے ہی کہیں چلا گیا تھا۔“ آصف نے کہا۔

”تو وہ نہیں مل سکا۔“ انور نے پوچھا۔

”نہیں، لیکن اس کی تلاش جاری ہے۔“ آصف نے کہا۔ ”مینجر نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ ایک ہفتہ قبل اس نے اِس ڈائریکٹر کو ملازم رکھا تھا اور یہ نیا ڈرامہ اسی کا لکھا ہوا تھا۔ اس نے اسے ڈائریکٹ بھی کیا تھا۔

مینجر نے یہ بھی بتایا کہ آج شام کو جب یہ معلوم ہوا تھا کہ نقلی کارتوس ختم ہو گئے تو اس نے مصنوعی دھماکے کی رائے دی تھی اور اس کے لیے ایک زیادہ آواز والا پٹاخا پستول کی آواز پیدا کرنے کے لیے بے تُکا ثابت ہو گا۔ مگر اس نے کوئی دھیان نہیں دیا اور دیتا بھی کیسے جب کہ اسے اس دھماکے میں سائبان والی رائفل کی آواز چھپانی تھی۔“

”ڈائریکٹر کا حلیہ۔“

”حلیہ پوچھتے ہو۔“ آصف نے کہا۔ ”اگر میرے سر پر اس وقت بم گر پڑتا تو بھی

مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی کہ اس کا حلیہ معلوم کر کے ہوئی۔"

"یعنی۔۔۔؟" انور نے ہمہ تن سوالیہ نشان بن کر پوچھا۔

آصف نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر انور کے سامنے ڈال دی۔

"یہ تو اسی آدمی کی تصویر ہے جس کی لاش تمہیں جلی ہوئی کار میں ملی تھی۔" انور نے کہا۔

"اور تمہیں بھی بتا چکا ہوں کہ مقتول کی داڑھی مصنوعی تھی۔" آصف بولا۔

"تمہیں یہ تصویر ملی کہاں سے۔"

"منیجر نے دی ہے۔"

"حیرت۔۔۔!" انور آہستہ سے بڑبڑایا۔

"اور میں اسی لیے تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان حادثات سے تمہارا کیا تعلّق ہے۔" آصف نے بے تابی سے کہا۔

”اور یہی تمہاری زبردست حماقت ہے۔“ انور مُسکرا کر بولا۔

”دیکھو انور باتوں میں نہ ٹالو۔“

انور کُچھ سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آصف سے مخاطب ہوا۔

”اگر میں یہ کہوں کہ یہ داراب کی حرکت ہے تو تم کس حد تک یقین کرو گے۔“

”داراب۔۔۔!“ آصف اس طرح اُچھلا جیسے یک بیک کرسی نے اچھّال دیا ہو۔

”ہاں داراب۔۔۔!“

”میں کس طرح یقین کر لوں۔“

”یقین نہ کرنے کی وجہ۔۔۔!“ انور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”ابھی تک اُس نے جتنی بھی وارداتیں کی ہیں ان میں خود کو ظاہر کر دیا ہے۔“ آصف نے کہا۔ ”اور اِس کے باوجود بھی پولیس اس کا پتہ لگانے میں ناکام رہی۔“

”کیا محکمہ سُراغ رسانی کے پاس داراب کا کوئی ریکارڈ ہے۔“ انور نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔!“ آصف موضوع بدل کر بولا۔ ”آخر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ ان حادثات کا تعلّق داراب سے ہے۔“

”اس نے مجھے چیلنج کیا ہے۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”وہ مُجھے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔“ انور نے کہا۔

”آخر کیوں؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔“

”بھلا تمہیں راستے سے ہٹانے اور ان وارداتوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔“

”یار آصف تمہاری عقل آج کل اتنی یتیم کیوں ہو گئی ہے۔“ انور مُسکرا کر بولا۔ ”اِس لاش کے ساتھ میری ڈائری کا پایا جانا کیا معنی رکھتا ہے اور پھر تم لوگوں کے ساتھ مُجھے بھی تھیٹر کے لیے مدعو کیا گیا؟ تم خود بتاؤ! اگر میری بجائے کوئی اور

ہوتا تو اس وقت وہ کہاں ہوتا۔"

"ٹھیک ہے۔!" آصف کُچھ سوچتا ہوا بولا۔ "لیکن تم اب بھی خود کو محفوظ نہ سمجھو۔"

"اوہو۔۔۔!" انور مُسکرا کر بولا۔ "تُو کیا تم سچ مچ ہتھکڑیاں لائے ہو۔"

"میں لایا تو نہیں لیکن حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو سراسر تمہارے خلاف ہیں۔" آصف نے کہا۔ "اور تم کسی وقت بھی سرکاری مہمان خانے کی زینت بنائے جاسکتے ہو۔"

انور ہنسنے لگا اور رشیدہ آصف کو گھورنے لگی۔

"کیوں بھئی تُم مُجھے اس طرح کیوں گھور رہی ہو۔" آصف نے کہا۔

"میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ کیا واقعی آپ عنقریب ترقّی کرنے والے ہیں۔"

انور نے زور دار قہقہہ لگایا اور آصف جھینپ گیا۔

"کیوں بھئی شیلا رانی کے متعلّق تمہارا کیا خیال ہے وہ کون تھی کیوں قتل کی گئی۔" انور نے پوچھا۔

"ابھی اتنی جلدی اس کے متعلّق کیا معلوم ہو سکتا ہے۔" آصف نے کہا۔

رشیدہ کُچھ بولنا ہی چاہتی تھی کہ انور نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور وہ خاموش ہو گئی۔

"واقعی انور تم خطرے میں ہو۔" آصف بولا۔

"ٹھیک ایک طرف قانون شکنی کرنے والے قانون کے محافظ ہیں اور ایک طرف ایک ایسا شخص جو قانون کو کھلونا سمجھتا ہے اور درمیان میں میں۔ لیکن یاد رکھو کہ فتح میری ہی ہو گی۔"

"خیر۔۔۔!" آصف اٹھتا ہوا بولا۔ "میں یہ کبھی نہ چاہوں گا کہ تُم جیل کی صورت دیکھو۔"

"شکریہ۔۔۔ شکریہ۔۔۔!" انور طنزیہ انداز میں بولا۔

آصف کے چلے جانے کے بعد وہ رشیدہ سے مخاطب ہوا۔

"شیلا رانی کون تھی؟"

"رقاصہ تھی۔" رشیدہ نے بھولے پن سے کہا۔

"پھر وہی۔۔۔!"

"یعنی۔۔۔!"

"بتاؤ نا وہ کون تھی۔"

"بھلا میں کیا جانوں۔"

انور اُسے تیز نظروں سے گھورنے لگا۔ رشیدہ نے نظریں جھکا لیں۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مُسکراہٹ پھیل رہی تھی۔

کرنل جاوید

"کرنل جاوید کا نام سُنا ہے کبھی۔" رشیدہ تھوڑی دیر بعد بولی۔

"کرنل جاوید۔" انور آہستہ سے بڑبڑایا۔ شاید وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اچانک بولا۔ "وہی تو نہیں جس کے گھوڑے ریس میں دوڑتے ہیں۔"

"وہی وہی۔۔۔!" رشیدہ دھیرے سے بولی۔ "شیلا رانی اُسی کی لڑکی تھی۔"

"کیا مطلب۔۔۔ تم نے افیون تو نہیں کھائی۔"

"شاید رقاصہ کا نام تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اس کا اصلی نام شاہدہ

تھا۔" رشیدہ بولی۔

"بہت خوب۔۔۔!" انور مُسکرا کر بولا۔ اس کی آنکھوں سے بے اعتباری جھلک رہی تھی۔

رشیدہ جھنجھلا اٹھی۔

"تم خود کو نہ جانے کیا سمجھتے ہو۔" رشیدہ جھلّا کر بولی۔ "جس طرح تم شہر بھر کی باتوں کی اِطّلاع رکھتے ہو اسی طرح دوسرے بھی رکھ سکتے ہیں اور پھر تم ایسے کہاں کے لال بجھکڑ نکل پڑے ہو کہ غیب دانی کا دعوی کر سکو۔"

"غصّے میں تُم بہت پیاری لگتی ہو۔" انور مُسکرا کر بولا۔ "میں اسے محض اس لیے مذاق سمجھا تھا کہ کرنل جاوید لاولد مشہور ہے۔"

"لیکن مُجھ سے زیادہ اُس کے معاملات کو اور کون جان سکتا ہے۔" رشیدہ خود اعتمادی کے ساتھ بولی۔ "تمہیں شاید نہیں معلوم کہ کرنل جاوید۔۔۔ مگر نہیں میں نہ بتاؤں گی اس لیے کہ تم نے اپنے متعلّق مُجھے آج تک کُچھ نہیں بتایا۔"

"مجھے تمہارااور اس کا رشتہ جاننے کی ضرورت نہیں۔" انور نے لاپروائی سے کہا۔

"کرنل جاوید کی شادی ایک قدامت پسند گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کی بیوی کو اُس کی بے راہ روی ناپسند تھی اور ان دونوں کے درمیان جاوید کی مغرب پسندی باعث تکرار بنی ہوئی تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دِن اُن دونوں کو الگ ہو جانا پڑا۔ شاہدہ ننہال میں پیدا ہوئی۔ اسی دوران میں کرنل جاوید مغربی ملک کی سیر کے لیے یہاں سے چلا گیا اور اس کی واپسی تقریباً۔۔ سال کے بعد ہوئی۔ شاہدہ کی ماں اس کی پیدائش کے چند روز بعد ہی مر گئی تھی۔ اس کی پرورش اس کی نانی نے کی، حالانکہ اس کے ننہال والے قدامت پسند تھے لیکن نہ جانے کس طرح شاہدہ کو بچپن ہی سے رقص و موسیقی کا چسکا لگ گیا اور وہ انتہائی پابندیوں کے باوجود رقّاصہ بنتی گئی۔ اسے عوام میں اپنے فن کے مظاہرے کا شوق تھا۔ اس کے ننہال والے کرنل جاوید سے اس درجہ ناراض تھے کہ انہوں نے اس سے کوئی تعلّق نہ رکھا شاید اسے اس کی بھی اِطلاع نہ تھی کہ اس کے کوئی لڑکی بھی ہے۔ ننہال والوں نے جب یہ دیکھا کہ شاہدہ ان کیلیے بدنامی کا باعث بن رہی ہے

توانہوں نے اُسے جاوید کے گھر بجھوادیا۔ اس دوران میں کرنل جاوید سرد گرم کا تجربہ ہو جانے کے بعد بہت کُچھ بدل گیا تھااور اس کی مشرقیت پھر سے عود کر آئی تھی۔ اسے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ صاحبِ اولاد ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے دکھ بھی ہوا۔ وہ شاہدہ کی فن پرستی کے خلاف تھا۔ شاہدہ نے جب اسٹیج پر جانے کا خیال ظاہر کیا تو کرنل جاوید کانپ اٹھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی لڑکی مجمع عام میں اپنے فن کا مظاہرہ کرے۔ وہ ایک ضدّی آدمی تھا۔ آخر کار دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا۔ کرنل جاوید طوعاًو کرہاًاس بات پر رضامند ہو گیا کہ وہ اسے مغربی ممالک کا دورہ کرنے کیلیے مالی امداد دے گا۔ نہیں تو وہ باقاعدہ کسی مقامی تھیٹر میں شاہدہ جاوید کے نام سے نوکری کرلے گی اور اس چیز کا خاص طور سے پروپیگنڈا کرائے گی کہ وہ کرنل جاوید کی لڑکی ہے۔ اس طرح وہ شاہد سے شیلارانی بن گئی۔ آج کل وہ مغربی ملک سے واپس آنے کے بعد پلازامیں اپنے فن کا مظاہرہ کررہی تھی اور پھر ایسی حالت میں تم اس قتل کے بارے میں کیا سوچو گے۔"

"کرنل جاوید تو بہت امیر آدمی ہے۔"

"اور اس کی دولت زیادہ تر جواہر کی شکل میں ہے۔" رشیدہ بولی۔

"اور اب تم حیرت انگیز طریقہ پر اس کی مالک بننے والی ہو۔" انور سنجیدگی سے بولا۔

"کیوں۔۔۔؟" رشیدہ متحیّر ہو کر بولی۔ "مُجھ سے مطلب۔۔۔؟"

"خیر خیر۔۔۔" انور مُسکرا کر بولا۔ "میں سمجھا شاید تُم کسی ناول کی پر اسرار ہیروئن کی طرح اس قصّے میں داخل ہونے والی ہو۔"

"اس کا ایک وارث موجود ہے۔" رشیدہ انور کی بات پر دھیان نہ دیتی ہوئی بولی۔

"کون۔۔۔؟"

"اس کا بھتیجا۔"

"مُجھے افسوس ہے کہ میں اس سے بھی واقف نہیں ہوں۔" انور نے کہا۔ "لیکن

اب میں یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تُم اِن لوگوں سے کس طرح واقف ہو۔"

"تمہیں آم کھانے سے غرض ہے یا پیڑ گننے سے۔"

"نہیں میں پیڑ تک کھا جانا چاہتا ہوں۔"

"یہ ناممکن ہے۔" رشیدہ سنجیدگی سے بولی۔ "اِس سِلسِلے میں مُجھے بہت کُچھ بتانا پڑے گا۔ جس کے لیے میں فی الحال تیّار نہیں۔ لیکن وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے۔ جب تم میرے متعلّق سب کُچھ جان جاؤ گے، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ کرنل جاوید یا اس کے معاملات سے میرا کوئی تعلّق نہیں۔"

"خیر۔۔۔ خیر اب خود کو اتنا زیادہ پر اسرار مت بناؤ۔" انور بیزاری سے بولا۔

"میں تم سے کبھی یہ نہ پوچھوں گا کہ تم کس والئی ریاست کی صاحب زادی ہو۔"

رشیدہ کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ وہ کُچھ کہنے ہی والی تھی کہ سنبھل گئی اور اس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیلنے لگی۔

"تم اس طرح تاؤ دِلا کر بھی مُجھ سے کُچھ نہیں معلوم کر سکتے۔" رشیدہ ہنس کر بولی۔

"تم جاوید کے بھتیجے کے متعلّق بتا رہی تھیں۔" انور نے منہ سکوڑ کر کہا۔

"اس کا نام صابر ہے۔ پچھلے سال یورپ سے انجینئری کی اعلیٰ سند لے کر واپس آیا ہے۔"

"وہی صابر تو نہیں جس نے تجوریاں بنانے کا ایک کارخانہ یہاں قائم کیا ہے۔" انور چمک کر بولا۔

"وہی۔۔۔ وہی۔۔۔!" رشیدہ نے کہا۔ "اُس نے کئی عجیب و غریب قسم کی تجوریاں ایجاد کی ہیں اور انہیں یہاں کے سرمایہ داروں کے ہاتھ فروخت بھی کیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز تجوری وہ ہے جو اس نے اپنے چچا کرنل جاوید کو تحفتہً پیش کی ہے۔ اس کا ہینڈل گھماتے ہی اس میں سے گیت سُنائی دینے لگتے ہیں۔ حفاظت کے خیال سے کرنل جاوید غالباً اپنے جواہرات اس تجوری میں

رکھتا ہے۔“

رشیدہ خاموش ہو گئی اور انور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ پھر اس نے اپنی نگاہیں دیوار میں لگے ہوئے کلاک پر جما دیں۔ ایک بج چکا تھا۔ انور نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کمرے سے نکل گیا۔ رشیدہ اسے پکارتی رہی وہ چند لمحوں کے بعد نیچے گیراج سے موٹر سائیکل نکال رہا تھا۔

کرنل جاوید کی کوٹھی سر کلر روڈ پر واقع تھی۔ اس سڑک پر اس سے عظیم الشّان کوٹھی کوئی اور نہ تھی۔ یہاں کرنل جاوید اپنے ملازمین کے ساتھ تنہا رہتا تھا۔ شہر کی ممتاز شخصیتوں میں اس کا شمار تھا۔ لیکن وہ اپنے طبقے میں پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور اس کی وجہ خود انہیں بھی نہیں معلوم تھی جو اسے ناپسند کرتے تھے۔ وہ بد مزاج بھی نہیں تھا۔ ظاہری اخلاق بھی کسی سے کم نہیں رکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی کسی سوسائٹی میں اس کی موجودگی لوگوں کیلیے دردِ سر بن جاتی تھی۔

اس وقت کوٹھی پر سکوت طاری تھا۔ بعض کمروں کی کھڑکیوں سے گہری سبز رنگ کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ پھاٹک پر چوکیدار بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ انور کی موٹر سائیکل جیسے اس کے قریب رکی وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا کرنل صاحب گھر پر موجود ہیں۔" انور نے اس سے پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟" چوکیدار نے تعجّب سے پوچھا۔

"جو کُچھ پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔"

"جی ہاں وہ غالباً سو گئے ہیں۔"

"انہیں جگا دو۔۔۔! میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"آپ آخر ہیں کون۔۔۔؟"

انور نے جیب سے اپنا ملاقاتی کارڈ نکال کر چوکیدار کو تھما دیا۔

"مگر۔۔۔ مگر صاحب۔"

"کُچھ نہیں۔۔۔!" انور ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "وہ کارڈ دیکھتے ہی مُجھے اندر بُلالیں گے۔"

چوکیدار پائیں باغ سے گزرتا ہوا برآمدے میں چلا گیا۔ شاید وہ برآمدے میں کسی نوکر کو جگا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد برآمدے میں روشنی ہو گئی۔ انور بار بار بے چینی سے اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا۔

پندرہ منٹ گزر گئے، پھر نشست کے کمرے میں بھی روشنی ہو گئی اور چوکیدار واپس آیا۔ اس نے انور کو اندر چلنے کو کہا۔ انور نے موٹر سائیکل وہیں پھاٹک پر چھوڑ دی اور خود برآمدے سے گزرتا ہوا نشست کے کمرے میں آ گیا۔

کمرہ شاندار طریقہ سے سجا ہوا تھا اس میں وہ سب لوازمات موجود تھے جو ایک جدید طرز کے ڈرائنگ روم کے لیے ضروری ہیں۔

چند لمحوں کے بعد ایک ادھیڑ عمر کا طویل القامت آدمی شب خوابی کے لبادے میں ملبوس کمرے میں داخل ہوا۔ چہرے پر روشنی کے آثار تھے۔ جن کے متعلّق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ وقتی تھے یا مُستقل، بہر حال انداز سے یہ ضرور ظاہر

ہو رہا تھا کہ انور کی ناوقت آمد اسے ناگوار گزری ہے۔

”میں آپ کے متعلّق بہت کُچھ سُن چکا ہوں۔“ وہ ایک صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔
”لیکن یہاں اس وقت آپ کی موجودگی باعث حیرت ہے۔“

”مُجھے افسوس ہے کہ میں نے ناوقت آپ کو تکلیف دی۔“

”خیر۔۔۔ خیر۔۔۔“ کرنل جاوید بے چینی سے پہلو بدل کر استفہامیہ انداز میں بولا۔

”میں شیلا رانی کے متعلّق کُچھ جاننا چاہتا تھا۔“ انور بے ساختہ بولا۔

کرنل جاوید چونک کر اُسے گھورنے لگا۔ لیکن پھر اس نے اپنی اس کیفیت کو مصنوعی استعجاب اور غصّے میں چھپانے کی کوشش شروع کر دی۔

”میں اس بکواس کا مطلب نہیں سمجھا۔“ کرنل گرج کر بولا۔ ”شاید تم نشے میں بہک کر اِدھر آئے ہو۔“

"میں شراب نہیں پیتا۔" انور منہ سکوڑ کر بولا۔ "اگر آپ شیلا رانی کے متعلّق کُچھ نہیں بتانا چاہتے تو شاہدہ ہی کے متعلّق کُچھ بتائیے۔"

کرنل اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پہلے وہ خوفزدہ نظروں سے انور کو گھورتا رہا پھر دفعتاً اس کی آنکھوں سے نفرت جھانکنے لگی۔

"ہاں اب تو تم مُجھے بلیک میل کرنے آئے ہو۔" وہ گرج کر بولا۔ "خیر میرے پاس کُتّوں کا منہ بند کرنے کے لیے کافی دولت ہے بولو اسے راز رکھنے کے لیے کتنی قیمت طلب کرتے ہو۔"

"اب آپ نشے میں معلوم ہوتے ہیں۔" انور مُسکرا کر بولا۔ "میں سوائے پولیس والوں کے اور کسی کو بلیک میل نہیں کرتا۔"

"پھر تم اس وقت یہاں کیوں آئے ہو۔"

"ایک خبر سُنانے۔"

کرنل اُسے گھورنے لگا۔

"کسی نے شیلا رانی کو سٹیج پر قتل کر دیا۔"

"ارے۔۔۔!" کرنل بے اختیار چونک پڑا۔ اس کے تیکھے خدوخال پر آہستہ آہستہ افسردگی پھیلتی جارہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ وہ آہستہ سے ایک صوفے پر بیٹھ کر خلاء میں تاکنے لگا۔

"اور میں یہ بتانے آیا تھا کہ اگر پولیس کو یہ اطلاع ہو گئی تو آپ بہت پریشان کئے جائیں گے۔"

"پولیس۔۔۔!" کرنل چونک کر انور کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد پھر بولا۔ "میں پولیس کو اس کی اطلاع دے دوں گا۔"

"آپ کے بھتیجے صابر صاحب کہاں مل سکیں گے۔" انور نے پوچھا۔

"صابر! کیوں؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس قتل میں صابر کا ہاتھ ہے۔"

"یہ سب تو پولیس سمجھے گی۔" انور نے کہا۔ "ویسے شُبہ تو ان پر بھی کیا جا سکتا ہے۔"

”شُبہے کی وجہ۔۔۔!“

”شاہدہ کے بعد وہی آپ کی جائیداد کے مالک ہو سکتے ہیں۔“

”بکواس ہے، صابر ایک مہینہ سے شہر میں نہیں ہے۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ انور نے کہا۔ ”سازش یہاں سے ہزاروں میل کی دوری سے کی جاسکتی ہے۔“

”خاموش رہو۔“ کرنل اُٹھتا ہوا بولا۔ ”کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں دنیا میں بالکل تنہا رہ جاؤں۔“

انور نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے کرنل کی بدلتی ہوئی حالتوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

”تم مُجھے قطعی خوفزدہ نہیں کر سکتے۔“ کرنل گرج کر بولا۔ ”میں شاہدہ کے اس انجام پر مغموم نہیں ہوں، جو کُچھ بھی ہوا بہت اچھّا ہوا۔ میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔“

"کرنل صاحب آپ کو غَلَط فہمی ہے۔" انور مُسکرا کر بولا۔ "میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا۔"

"ہو گا۔۔۔ہو گا۔۔۔!" کرنل بیزاری سے بولا۔

"ایک تکلیف اور دوں گا۔" انور نے جیب سے ایک تصویر نکالتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ نے کبھی اس شخص کو دیکھا ہے۔"

کرنل تصویر دیکھنے لگا۔ دفعتاً اُس کا چہرہ غصّہ سے سُرخ ہو گیا۔

"آخر تمہارا مطلب کیا ہے۔" وہ گرج کر بولا۔

"آخر اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔" انور نرمی سے بولا۔

"یہ میرا جوانی کا فوٹو ہے۔ جب میں داڑھی رکھے ہوئے تھا۔" کرنل اسے گھورتا ہوا بولا۔

"یہ اُسی پر اسرار آدمی کی تصویر تھی، جو خود کو داراب کے گروہ کا ایک فرد ظاہر

کرتا تھا۔ یہ اس کی تصویر تھی جس کی لاش جلی ہوئی کار میں ملی تھی اور یہی پلازا تھیٹر میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔"

حیرت انگیز تجوری

کرنل جاوید کے بے حد اصرار پر بھی انور نے اُسے یہ نہ بتایا کہ وہ تصویر اسے کہاں سے ملی تھی۔ کرنل جاوید کا غصّہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ انور کو دھکے مار کر اپنی کوٹھی سے نکال دے۔ انور خود ہی وہاں سے چلا آیا۔ راستہ بھر اس کا ذہن تصویر والے معاملے میں اُلجھا رہا۔ اب وہ آدمی حد درجہ پر اسرار بنتا جا رہا تھا اور انور صحیح معنوں میں داراب کی حیرت انگیز شخصیت کا قائل ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن اس نے ہمّت نہیں ہاری۔ اس کے لیے اس سے زیادہ تحقیر آمیز بات کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ اب پیچھے ہٹ جاتا۔

گھر پہنچ کر اس نے کپڑے اتارے اور سو گیا۔ اس کا سونا بھی عجیب تھا۔ گہرے تفکّر کے عالم میں اُسے ہمیشہ گہری نیند آتی تھی۔ خیالات کا تسلسل اسے سونے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔

بہر حال اس نے اپنی پوری زندگی ایک مشینی نظام میں ڈھال کر رکھ دی تھی۔

دوسرے دن صبح اسے رشیدہ نے جگایا۔ انسپکٹر آصف باہر کے کمرے میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ انور نے اٹھ کر کپڑے تبدیل کیے اور نشست کے کمرے میں آیا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی زہریلی مسکراہٹ پھیل رہی تھی جسے دیکھ کر آصف خواہ مخواہ اپنی توہین محسوس کرنے لگتا تھا۔

"تم کل رات کرنل جاوید کے یہاں گئے تھے۔" آصف نے بے ساختہ پوچھا۔

"میں کل رات سارے واقعات یکسر بھول گیا ہوں۔" انور بیٹھتا ہوا بولا۔ "مجھے سوچنے کی مہلت دو۔"

"کرنل جاوید غائب ہو گیا۔" آصف نے کہا۔

"تم یقین کرو کہ وہ میری جیبوں میں نہیں ہے۔" انور سنجیدگی سے بولا۔

"تو تم اس کے یہاں گئے تھے۔" آصف نے کہا۔

"ہاں۔۔۔!"

"کیوں۔۔۔!"

"یہ پوچھنے کے لیے کہ آئندہ ریس میں اس کا کون سا گھوڑا دوڑے گا۔"

"پھر تم نے بکواس شروع کی۔"

"دیکھو مسٹر آصف میں بدتمیزی نہیں پسند کرتا۔" انور منہ سکوڑ کر بولا۔

آصف اسے گھورنے لگا لیکن پھر فوراً ہی اس کے رویّے میں تبدیلی واقع ہو گئی۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے انور کے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبالیا۔ دو تین کش لینے کے بعد وہ نیم باز آنکھوں سے انور کی طرف دیکھنے لگا۔

”انور تم جانتے ہو کہ میں تمہیں کیا کہنا چاہتا ہوں۔“ آصف بولا۔

”کیوں رشو کیا خیال ہے۔“ انور نے رشیدہ کی طرف مُڑ کر کہا۔ ”میں بھی آصف سے محبّت شروع کر دوں۔“

”محبّت کا جواب محبّت ہی سے دینا چاہیے۔“ رشیدہ مسکرا کر بولی۔

”اچھا تو سُنو میری جان بوڑھے آصف۔۔۔!“ انور آصف کو آنکھ مار کر بولا۔ ”میں اسی وقت تم پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا ہوں۔ پوچھو کیا پوچھتے ہو؟“

”اب تم دونوں مل کر میرا مضحکہ اڑانا چاہتے ہو۔“ آصف بگڑ کر بولا۔

”ارے نہیں نہیں۔“ رشیدہ جلدی سے بولی۔ ”میں تو آپ کو ہمیشہ چچا سمجھتی ہوں۔“

”میں بھی رشیدہ کا چچا سمجھتا ہوں۔“ انور نے سنجیدگی سے کہا۔

”خیر خیر کبھی تم لوگ بھی بوڑھے ہو گے۔“

"تم نے آنے کا مقصد بیان نہیں کیا۔" انور احتجاجاً ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"کرنل جاوید کہاں غائب ہو گیا۔"

"عجیب آدمی ہو۔ بھلا میں کیا جانوں۔"

"تم اس سے ملے تھے۔" آصف نے کہا۔

"تو مجھے اس سے کب انکار ہے۔"

"اس نے تقریباً تین بجے رات کو پولیس کو اطلاع دی کہ شیلا رانی اس کی لڑکی تھی اور اس نے یہ بھی بتایا کہ شیلا کے قتل کی خبر تم نے اسے دی تھی اور پھر جب پولیس وہاں پہنچی تو وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ نوکروں نے بتایا کہ ڈیڑھ بجے ایک آدمی موٹر سائیکل پر آیا تھا۔ غالباً وہ تم تھے۔"

"تمہاری واپسی کے بعد کچھ پولیس والے وہاں پہنچے اور کرنل جاوید کو اپنے ساتھ لے گئے۔"

"تو پھر میں اس مسئلے میں کیا روشنی ڈال سکتا ہوں۔" انور نے کہا۔

"تم نہیں سمجھے۔" آصف دوسرا سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔ "پولیس والے اسے نہیں لائے۔"

"یقیناً تم اس وقت نشے میں ہو۔" انور بولا۔

"کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پولیس کے بھیس میں کچھ نامعلوم آدمی اسے لے گئے۔"

"اوہ۔۔۔!" انور کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "ظاہر ہے کہ ان آدمیوں سے میرا کوئی تعلّق نہیں۔"

"میں یہ نہیں کہتا۔"

"تم جب کرنل کے راز سے واقف تھے تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا۔"

"اوّل تو میں اِس راز سے تمہارے جانے کے بعد واقف ہوا اور اگر فرض کرو کہ

پہلے سے واقف بھی ہوتا تو یہ ضروری نہیں تھا کہ تمہیں اس سے مطلع کر دیتا۔“

”تمہیں اس کا علم کس طرح ہوا۔“ آصف نے پوچھا۔

”جس طرح عموماً ہوا کرتا ہے۔“

”آخر کس طرح۔“

”سر کے بل کھڑا ہو گیا تھا۔ اسی حالت میں مراقبہ کیا۔ منّتیں مانیں پھر الہام ہونے لگا۔ اس کے بعد تین بار مُرغ کی بولی بول کر سیدھا ہو گیا واللہ اعلم بالصواب۔۔۔!“

”تو تم نہیں بتانا چاہتے۔۔۔ خیر۔۔۔!“ آصف نے کہا۔ ”اب تک جتنی بھی وارداتیں ہوئی ہیں ان سب سے تمہارا کوئی نہ کوئی تعلّق ضرور ہوتا ہے۔“

”اور آئندہ بھی جو وارداتیں ہونے والی ہیں ان میں بھی تم یہی محسوس کرو گے۔“

”یعنی۔۔۔!“

”داراب سے باقاعدہ چھڑ گئی ہے۔“

”پھر تم داراب کو گھسیٹ لائے۔“

”خیر دیکھنا۔۔۔!“ انور نے کہا اور سگریٹ کے گہرے کش لینے لگا۔

”کرنل جاوید کی کوٹھی میں پولیس تعینات ہے۔“ آصف نے کہا۔ ”میں اس وقت وہیں جا رہا ہوں۔“

”تلاشی لینے پر کام کی بات معلوم ہوئی۔“ انور نے پوچھا۔

”نہیں میں اُن سے کہہ آیا ہوں کیا تم وہاں چل سکو گے۔“

”ہاں۔۔۔ہاں کیوں نہیں۔ بھلا میں تمہارے کام نہ آؤں گا تو پھر کون آئے گا۔“ انور اُٹھتا ہوا بولا۔ پھر وہ رشیدہ کی طرف مخاطب ہوا۔

”اگر مجھے دیر ہو جائے تو تُم آفس چلی جانا۔ میں سیدھا وہیں آؤں گا۔“

انور اور آصف کرنل جاوید کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔

"ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔" آصف بولا۔

"ایک کیا کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔" انور نے کہا۔

"پھر تُم نے مجھے غصّہ دِلانا شروع کیا۔" آصف بگڑ کر بولا۔

"بگڑو مت پیارے، میں جھوٹ نہیں کہتا اگر تُم چاہتے تو اب تک جاوید کو ڈھونڈ نکالتے۔"

"وہ کس طرح۔۔۔!"

"یہ بتاؤ کہ شیلا رانی کے قتل کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔" انور نے پوچھا۔

"کئی مقصد ہو سکتے ہیں۔" آصف نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ یہ کسی کی رقابت کا نتیجہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ خود کرنل جاوید ہی نے اسے قتل کرا دیا ہو! یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی کے پیشہ وارانہ حسد کا شکار ہوئی ہو۔"

انور مسکرانے لگا۔

"تم نے اس کے علاوہ کسی دوسرے امکان پر غور نہیں کیا۔" انور نے کہا۔

"یعنی۔۔۔!"

"کرنل جاوید کی دولت کا دوسرا حق دار۔۔۔!"

"اوہ۔۔۔ لیکن اس کے متعلق ایسا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔"

"کیوں؟"

"تمہاری مراد صابر ہی سے ہے نا۔۔۔!"

"قطعی۔۔۔!"

"لیکن وہ کافی باعزّت آدمی ہے اور خود بھی کافی دولت مند ہے۔ میں اس سے ایک بار مل چکا ہوں۔"

"آج کل وہ کہاں ہے۔" انور نے پوچھا۔

"کہیں باہر گیا ہوا ہے۔"

"اس کا تجوریوں کا کارخانہ دیکھا ہے۔"

"ہاں۔۔۔!"

انور خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کرنل جاوید کی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ پھاٹک پر دو سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ جن سے ایک خوش پوش نوجوان کھڑا اُلجھ رہا تھا۔ آصف کو دیکھ کر دونوں سپاہی خاموش ہو گئے اور نوجوان ان کی طرف مڑا۔

"اوہ صابر صاحب۔۔۔!" آصف اس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

"آخر یہ معاملہ کیا ہے۔" صابر آصف سے ہاتھ ملاتا ہوا بولا۔ "میں کل رات کو باہر سے واپس آیا ہوں۔ کرنل صاحب کہاں ہیں۔"

"یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے۔ صابر صاحب۔" آصف غم زدہ آواز میں بولا۔ اور انور نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ لیے۔ وہ صابر کو تیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ آصف صابر کو واقعات بتانے لگا۔ بار بار صابر کا منہ حیرت سے کھل جاتا تھا۔

خصوصاً شیلا رانی والے واقعہ پر تو وہ ہمہ تن استعجاب بن گیا تھا۔

"یہ میرے لیے ایک بالکل نئی اِطّلاع ہے۔" صابر بے چینی سے ہاتھ ملتا ہوا بولا۔

"آخر کرنل صاحب کہاں غائب ہو گئے۔"

"عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ شیلا رانی کے قتل میں انہیں کا ہاتھ ہے۔ اسی لیے وہ روپوش ہو گئے ہیں۔" آصف نے کہا۔

"ناممکن قطعی ناممکن، میں اس پر یقین نہیں کر سکتا۔ اگر یہی بات تھی تو انہوں نے خود ہی شیلا رانی کے راز سے پردہ کیوں اٹھایا۔ آخر اس میں بھی ان کی کوئی چال تھی۔ تب بھی روپوش نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر یہ بات ہوتی تو وہ پولیس کو اپنی ذات سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے۔"

"لیکن انہوں نے یہ راز ظاہر ہو جانے کے بعد پولیس کو قتل کی اِطّلاع دی تھی۔" آصف نے کہا۔

"تو پھر انہیں پولیس کو خود اِطّلاع دیئے بغیر غائب ہو جانا چاہیے تھا۔" صابر نے

کہا۔ پھر تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد بولا۔ "یہ کوئی بہت بڑی سازش معلوم ہوتی ہے۔ آپ وثوق کے ساتھ تو کہہ نہیں سکتے کہ پولیس کو فون پر اس کی اِطّلاع دینے والے کرنل صاحب ہی تھے کوئی اور بھی ایسی حرکت کر سکتا ہے۔ شیلا رانی کے متعلق پولیس کے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ کرنل صاحب کی لڑکی تھی، محض سُنی سنائی باتوں پر یقین کر لینا دانش مندی نہیں ہے۔ کیا آپ نے اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے کرنل صاحب کل رات یہاں کوٹھی پر موجود تھے۔"

"ایک یہی اس کے گواہ ہیں۔" آصف انور کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "یہ کل رات کو کرنل صاحب سے ملے تھے جس کی شہادت کوٹھی کے ملازموں نے بھی دی ہے۔ اس کے جانے کے بعد کچھ نامعلوم اشخاص پولیس کے بھیس میں کرنل صاحب کو کسی نامعلوم جگہ پر لے گئے۔"

"آپ کی تعریف۔۔۔!" صابر نے انور کی طرف دیکھ کر کہا۔ جو قطعی بے تعلقی کے ساتھ سگریٹ کا دھواں فضا میں منتشر کر رہا تھا۔

"روزنامہ اسٹار کے کرائم رپورٹر مسٹر انور سعید۔" آصف بولا۔

"ہوں۔۔۔!" صابر نے معنی خیز انداز میں سر ہلا کر کہا۔ "بھلا آپ ان سے کیوں ملنے آئے تھے۔"

"اپنی نئی غزل سُنانے کے لیے۔" انور انتہائی خوش اخلاقی سے بولا۔ "اس شہر میں بہت کم ایسے لوگ ملتے ہیں جو میری شاعری کی قدر کر سکیں۔ موصوف مجھے بے حد چاہتے تھے۔"

آصف کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ انور نے اسے گھور کر دیکھا۔

"بہر حال صابر صاحب، بہت ہوا کہ آپ تشریف لے آئے۔ آپ کی موجودگی میں اطمینان سے تحقیقات کر سکوں گا۔" آصف بولا۔

وہ تینوں کوٹھی میں آئے۔

"میں دراصل اس قسم کا کوئی ثبوت مہیّا کرنا چاہتا ہوں کہ شیلا رانی کرنل صاحب کی لڑکی تھی۔" آصف بولا۔

”ضرور مہیّا کیجیے۔“ صابر نے کہا۔ ”لیکن مجھے اس کہانی پر یقین نہیں آتا۔“

”کسی کو نہیں آسکتا۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”انتہائی بے سروپا بات ہے۔“

آصف پھر حیرت زدہ انداز میں انور کی طرف دیکھنے لگا۔

”شیلا رانی کے متعلّق آپ کی اپنی تحقیقات کا نتیجہ کیا نکلا۔“ آصف سے صابر نے پوچھا۔

”ابھی تک تو کچھ نہیں۔“ آصف نے کہا۔ ”میں کرنل صاحب کے کاغذات دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں ہاں۔۔۔ضرور۔۔۔!“ صابر نے کہا۔

آصف اور انور متعدّد کمروں میں چیزوں اور کاغذات کا جائزہ لیتے رہے تھے۔ صابر بھی ان کے ساتھ تھا۔ ایک کمرے میں پہنچ کر دفعتاً صابر اچھلا اور اس کے منہ سے استعجاب زدہ آوازیں نکلنے لگیں۔

انور اور آصف اس کی طرف مُڑے، صابر کی تحیّر آمیز نظریں سامنے رکھی ہوئی ایک قد آدم تجوری پر جمی ہوئی تھیں۔

”ڈاکہ۔۔۔ صریح ڈاکہ۔۔۔!“ صابر آہستہ سے بڑبڑایا۔

”کیا مطلب۔۔۔!“ آصف چونک کر بولا۔

”آپ اس تجوری کی طرف دیکھ رہے ہیں۔“ صابر نے کہا۔

آصف نے سر ہلا دیا۔

”یہ تجوری میں نے خاص طور سے اپنی نگرانی میں تیار کرائی تھی۔“ صابر نے کہا۔

”وہ تو سب کچھ ہے۔“ آصف اُکتا کر بولا۔ ”ابھی آپ ڈاکے کا تذکرہ کر رہے تھے۔“

”اس تجوری کو کسی نے غَلَط طریقے سے کھولا ہے۔“ صابر نے کہا۔ ”کرنل صاحب ایسا نہیں کرسکتے تھے۔“

"مگر تجوری تو بند ہے۔" آصف نے کہا۔

"یہ دیکھیے۔اِدھر آیئے۔ یہاں آپ ایک ابھری ہوئی سُرخ لکیر دیکھ رہے ہیں نا، یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس تجوری کو کسی ایسے آدمی نے کھولنے کی کوشش کی ہے جو اس کے صحیح استعمال سے واقف نہیں تھا اور اِدھر یہ تیر کا نشان یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس وقت بھی اس کا تالا بند نہیں ہے اس کا تالا کسی اوزار کی مدد سے توڑا گیا ہے۔ کُنجی سے نہیں کھولا گیا۔ تجوری کا ہینڈل دیکھئے یہ ڈھکنے کے کنارے سے پینتالیس درجے کے زاویے پر ہے۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ تالا بند نہیں ہے، ورنہ یہ نوّے درجے کے زاویے پر ہوتا۔"

"اگر فرض کیجیے کہ اس میں سے کوئی چیز چرائی گئی ہے تو اس کا علم کس طرح ہو گا۔" آصف نے کہا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس میں کون کونسی چیزیں رکھی جاتی تھیں۔"

"نہیں میں تو نہیں جانتا۔"

"یہ ایک اور دشواری ہوئی۔" آصف متفکّرانہ انداز میں بولا۔

اس کے بعد مکمّل سکوت چھا گیا۔ ہر شخص اپنی جگہ پر کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا۔

دفعتاً تجوری کے اندر سے کھڑ کھڑاہٹ کی آواز سُنائی دی اور صابر چونک پڑا۔

کھڑ کھڑاہٹ کی آواز ایک منٹ تک جاری رہی۔ پھر ایک قہقہہ سنائی دیا۔ تجوری کے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا۔ "کیوں؟ انور دیکھ لیا تم نے داراب کے راستے میں آنا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ میں پھر تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ پولیس کو بھٹکنے دو، تم ان معاملات میں دخل نہ دو اور آپ انجنیئر صاحب، آپ خود کو بہت بڑا انجنیئر سمجھتے ہیں۔ اب اس وقت اس طرح منہ کھولے کیوں کھڑے ہیں بتایئے نا میں کہاں سے بول رہا ہوں۔"

اور پھر ایک قہقہہ سُنائی دیا اور آواز آنی بند ہو گئی۔

صابر کے منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ انور نے اس طرح ہونٹ بنا رکھے تھے جیسے سیٹی بجانے کا ارادہ کر رہا ہو۔ آصف کبھی صابر کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی

انور کی طرف۔ ”خُدا کی قسم یہ بالکل نئی چیز ہے۔“ صابر تجوری کی طرف جھپٹتا ہوا بولا۔ دوسرے لمحہ میں تجوری کا ہینڈل اس کے ہاتھ میں تھا۔ ہاتھ کو جنبش ہوئی اور تجوری کا پٹ کھل گیا اور ساتھ ہی تجوری سے ایک گیت بلند ہوا۔

کوئی عورت سِتار اور طبلہ پر گا رہی تھی۔ صابر تجوری کے پاس سے ہٹ گیا۔ گیت جلد ہی ختم ہو گیا۔

”دیکھ رہے ہیں آپ تجوری بالکل خالی ہے۔“ صابر نے آصف سے کہا۔

”قطعی دیکھ رہا ہوں۔“ آصف نے کہا۔ ”مگر یہ آوازیں۔“

”ابھی آپ نے جو گیت سُنا وہ میری ہی کاری گری ہے۔ مگر پہلی آواز کا میں ذمّہ دار نہیں۔“

”قریب آیئے یہ دیکھئے۔ اس ہینڈل کا تعلّق اندر لگے ہوئے ایک گراموفون سے ہے جیسے ہی ہینڈل گھمایا جاتا ہے یہ چھوٹا سا ریکارڈ بجنے لگتا ہے۔ یہ میں نے اس لیے بنایا تھا کہ اگر کوئی چور رات کو کھولنے کی کوشش کرے تو گیت کی آواز سے

گھر والے جاگ پڑیں۔۔۔ لیکن وہ پہلی آواز۔۔۔" صابر اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

انور کے چہرے پر ایک پُر اسرار مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ وہ ان سب باتوں کو اتنی لاپروائی سے سن رہا تھا جیسے کوئی ہوش مند آدمی کسی بچے سے اس کے کھلونے کی آواز سنتا ہے۔ لیکن وہ قطعی خاموش تھا۔

"آصف صاحب۔۔۔!" صابر مُڑ کر بولا۔ "شاید میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا سمجھوں۔"

آصف سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"اس تجوری میں ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر رکھا ہوا ہے۔" صابر نے کہا۔ "جس کا میری ذات سے کوئی تعلّق نہیں اور وہ پہلی آوازیں شاید اسی ٹرانسمیٹر سے آئی تھیں۔۔۔ تجوری کھولنے والے نے شاید یہ ٹرانسمیٹر یہاں رکھا ہے۔"

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔" انور نے کہا۔ "مُمکن ہے کہ کرنل صاحب ہی نے رکھا ہو۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے۔" صابر بے چینی سے بولا۔ "لیکن تجوری خالی کیوں ہے۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ یہ جانتے ہیں کہ اس تجوری میں کیا رکھا جاتا تھا۔" انور نے کہا۔

"میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔" صابر بولا۔ "لیکن جہاں تک میرا خیال ہے وہ اس میں اپنے جواہرات رکھتے تھے۔"

"جواہرات!" آصف چونک کر بولا۔

"جی ہاں! یہ بات تو کافی مشہور ہے کہ کرنل صاحب کے پاس بعض بیش قیمت جواہرات ہیں۔" صابر نے کہا۔

"خود آپ نے کبھی نہیں دیکھا۔"

"نہیں۔ نہ میں نے کبھی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور نہ کرنل صاحب نے دکھائے۔"

”قدرتی بات ہے۔ آصف صاحب۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”ظاہر ہے کہ وہ کرنل صاحب کے بعد صابر صاحب کی ہی ملکیت ہوتے۔ اس لیے صابر صاحب کی سیر چشمی کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔“

صابر انور کو گھورنے لگا۔

”تو جناب آصف یہ معاملہ بالکل صاف ہو گیا ان وارداتوں میں داراب کا ہاتھ ہے۔“ انور نے کہا۔ ”اب دیکھنا یہ ہے کہ داراب اور کرنل صاحب میں کیا تعلّق ہے۔“

”تب تو پولیس کی جدوجہد بالکل بے کار ہے۔ پولیس نے اس کا کیا بنا بگاڑ لیا ہے۔“

”ایسا نہ کہیے صابر صاحب۔“ آصف نے کہا۔ ”کوئی مجرم ہمیشہ آزاد نہیں رہ سکتا۔“

”ایک نہ ایک دن خداوند تعالیٰ اُسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر ہی دیتا ہے۔“ انور سنجیدگی سے بولا اور صابر بے اختیار ہنس پڑا۔ آصف نے منہ سکوڑ لیا لیکن وہ

کچھ بولا نہیں۔

”اِس ٹرانسمیٹر پر مُجرم کی انگلیوں کے نشانات ضرور ہوں گے۔“ آصف نے کہا۔

سگریٹ کیس

"ضرور ہوں گے۔" انور نے کہا۔ "اچھا اب میں چلا۔"

"کیوں۔۔۔!"

"ابھی تک کوئی ایسی سنسنی خیز بات نہیں معلوم ہوئی، جو مجھے دلچسپی لینے پر مجبور کر سکے۔"

"یہ ٹرانسمیٹر۔" آصف نے کہا۔

"ہاں ہاں۔۔۔ ٹرانسمیٹر میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں، اس سے

داراب کو پکڑنے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ وہ نہ جانے کہاں سے بولا ہو گا زیادہ سے زیادہ تم اس کے ذریعہ وہ سمت معلوم کر لو گے جدھر سے آواز آئی ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اچھا اب میں آفس جاؤں گا۔"

انور انہیں وہیں چھوڑ کر آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں اسے خیال آیا کہ اس نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا۔ اس نے ایک ریستوران کے سامنے موٹر سائیکل روک دی۔

چائے کی چسکی لیتے وقت اس نے سگریٹ کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا پھر دوسرے جیب میں۔ پتلون کی جیبیں بھی دیکھیں، لیکن سگریٹ کیس نہ ملا۔ انور نے مسکرا کر ایک طویل سانس لیا اور کسی نئے حادثے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کی ڈائری ایک بار مصیبت کا باعث بن چکی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سگریٹ کیس کس حادثے کی اطلاع ہے۔ لیکن اسے کوئی پریشانی نہ تھی۔ وہ زندگی کو ایک جوئے سے زیادہ وقعت نہ دیتا تھا۔ ہار یا جیت اس کے علاوہ کوئی اور تیسری چیز نہیں ہو سکتی۔ زندگی کی اس عظیم جدوجہد میں اگر ایک بار وہ پِس بھی

گیا تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ دنیا بدستور اپنے راستے پر چلتی رہے گی۔ اس کے بعد کوئی دوسری گوشت پوست کی مشین اس کی جگہ لے لے گی۔ پھر پریشانی کس بات کی۔

اس نے ویٹر کو آواز دے کر سگریٹ منگائیں اور ایک سُلگا کر کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔

ریستوران میں کافی بھیڑ تھی۔ شاید ہی کوئی میز خالی رہی ہو۔

"اوہ تو تم یہاں ہو!" کسی نے پیچھے سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ آواز نسوانی تھی۔ انور نے پیچھے مڑے بغیر کنکھیوں سے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا جو اس کے کاندھے پر رکھا ہوا تھا۔ ایک نرم و نازک خوبصورت ہاتھ، انگلیاں خوبصورت اور سبک سی انگوٹھیوں سے مزیّن تھیں اور پھر ایک نوجوان عورت اس کے برابر کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ انور اس کی طرف مُڑا اور وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"اوہ معاف کیجیے گا مجھے غَلَط فہمی ہوئی۔" وہ ندامت آمیز انداز میں بولی۔

"کوئی بات نہیں ہے۔ تشریف رکھیے۔" انور انتہائی خوش اخلاقی اور شرافت سے بولا۔ "ویسے بھی اس وقت کوئی میز خالی نہیں ہے، مجھے آپ سے مل کر مسرّت ہو گی۔"

اور اس کی خوش اخلاقی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔

اس نے ابھی اپنے کوٹ کے نچلے جیب میں ایک وزن سا محسوس کیا تھا اور اب بھی محسوس کر رہا تھا۔ بظاہر وہ اس کی طرف سے لا پروائی برتتا رہا وہ فوراً ہی یہ نہیں ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس کا سگریٹ کیس ابھی ابھی حیرت انگیز طریقے پر اس کی جیب میں واپس آگیا ہے۔

انور نے اپنے چہرے پر اور زیادہ شرافت کے آثار پیدا کئے اور وہ کسی دیوتا کی طرح معلوم نظر آنے لگا۔

عورت بیٹھ گئی۔

"میں کیا بتاؤں کہ آپ میرے دوست سے کتنی مشابہت رکھتے ہیں۔" عورت مسکرا کر بولی۔

"اللہ پاک بڑی شان اور قدرت والا ہے۔" انور ٹھیک مولویانہ انداز میں بولا۔

"آپ چائے پئیں گی یا کافی۔"

"اوہ شکریہ۔ اس کی زحمت نہ کیجیے۔" عورت نے کہا۔ "میں خود منگوالوں گی۔"

"آپ میرا دِل توڑ رہی ہیں۔ فرض کیجیے میں آپ سے دوستی پیدا کرنا چاہتا ہوں تو۔۔۔!" انور مسکرا کر بولا۔ "اس کے بعد آپ یقیناً مجھے اپنے گھر پر بلا کر چائے پلائیں گی۔ اس کے بعد میں آپ کو مدعو کروں گا۔ اسی طرح زندگی بھر ہم دونوں ایک دوسرے کو دعوتیں دیتے رہیں گے اور پھر زندگی میں سوائے کھانے پینے کے اور رکھا ہی کیا ہے۔ آپ مجھے پیٹو سمجھیں گی لیکن ایسا نہیں میں صرف چٹورا ہوں۔ پیٹو اور چٹورے میں بڑا فرق ہے۔ پیٹو ہر چیز پیٹ بھر کر کھانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن چٹورا دنیا کی ساری چیزیں ذرا ذرا سی چاٹ کر چھوڑ دینا

چاہتا ہے۔ چاٹ پر مجھے بارہ مصالحے کی چاٹ یاد آ گئی۔ مگر شاید یہاں اس ریستوران میں نہ ملے۔ میری باتوں کا بُرا مت مانئے گا۔ میں ذرا کچھ بے وقوف سا آدمی ہوں۔ ویسے دِل کا بُرا نہیں۔"

عورت ہنسنے لگی۔

"آپ واقعی دِلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔۔۔ ایک اچھے دوست ثابت ہوں گے۔" عورت نے اپنا ہینڈ بیگ میز کے نیچے رکھ کر آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

انور نے بیرے کو آواز دے کر چائے اور پیسٹریوں کا آرڈر دیا۔ پھر عورت کی طرف جھک کر رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگا۔

"اس ریستوران کے سارے ویٹر مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ اچھا آپ ہی ایمانداری سے بتائیے کہ میں صورت سے بھی بے وقوف معلوم ہوتا ہوں۔"

"قطعی نہیں۔۔۔!" عورت شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"سچ مچ ہم اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔" انور اور بھی رازدارانہ انداز میں

بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں کافی خوبصورت آدمی ہوں۔ لیکن لوگوں نے بے وقوف مشہور کر دیا۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ کوئی لڑکی مجھ سے شادی کرنے پر رضامند نہیں ہوتی۔ خیر میں نے بھی تہیّہ کر لیا کہ تمام عمر شادی نہ کروں گا۔ ویسے بہتیری لڑکیاں میری دوست ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ بے وقوف کے دونوں گال خود بخود پھڑکتے رہتے ہیں۔ ذرا دیکھئے اس وقت میرا بایاں گال پھڑک رہا ہے یا نہیں ذرا اور قریب سے دیکھیے۔“

عورت جھک کر دیکھنے لگی۔ سچ مچ انور کا بایاں گال خود بخود پھڑک رہا تھا۔ عورت ہنسنے لگی۔

”یہ دیکھیے۔۔۔ یہ دیکھیے۔۔۔ داہنا بھی پھڑکنے لگا۔“

عورت جھک کر دیکھنے لگی۔ اس دوران میں انور نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا اور اسے میز کے نیچے رکھے ہوئے ہینڈ بیگ میں ڈال دیا۔ عورت کو خبر تک نہ ہوئی۔ وہ بدستور انور کے گالوں کی پھڑکن دیکھ دیکھ کر ہنستی رہی۔

”ہاں تو یہ ہے میری دکھ بھری داستان۔“ انور سیدھا ہو کر بولا۔ ”اب بتایئے آپ کو میں بے وقوف لگتا ہوں یا نہیں۔“

”قطعی نہیں۔“عورت سنجیدہ بننے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔

”خدا آپ کو خوش رکھے۔ آپ پہلی عورت ہیں جس نے مجھے بے وقوف نہیں سمجھا۔ چائے پیجئے۔“ انور نے اس کے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔

عورت اِس دوران میں بار بار اپنی گھڑی کی طرف دیکھتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے وقت کا بڑا خیال ہے۔

”اب ہم دونوں اس طرح ملتے رہیں گے۔“ انور نے بچگانہ انداز میں کہا۔

”ضرور ضرور۔۔۔!“ عورت مسکرا کر بولی۔ "واقعی آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔“

”میں شاعر بھی ہوں۔“ انور آگے کی طرف جھک کر بولا۔

”اوہ۔۔۔اچھا۔۔۔؟تب تو آپ سے مل کر اور بھی خوشی ہوئی۔“

”میرے والد صاحب بھی شاعر تھے۔“

”اچھا۔۔۔!“

”دادا صاحب بھی اور پر دادا بھی۔“

”تب تو آپ بہت اچھے شاعر ہوں گے۔“عورت نے مسکرا کر کہا۔ ”کبھی ہماری طرف بھی آیئے گا۔ایک سو بیس آسکر سٹریٹ میں رہتی ہوں۔“

”اور آپ کے۔۔۔!“

”میں ابھی پڑھ رہی ہوں۔“عورت جلدی سے بولی۔

”اوہو ہو ہو۔“ انور بچّوں کی طرح ہنستا ہوا بولا۔ ”تب تو میں ضرور آؤں گا۔ تو آپ واقعی مجھے بے وقوف نہیں سمجھتیں۔“

”نہیں قطعی نہیں۔“

"اگر آپ مجھے بے وقوف نہ سمجھیں تو میں آپ کا نام پوچھنے کی جرأت کروں۔"

"میرا نام نجمہ ہے۔"

"آپ سچ مچ نجمہ ہیں۔ نجم معنی ستارہ آپ کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمکدار ہیں۔۔۔ مگر آپ دُمدار ستارہ نہیں، میں نے سُنا ہے کہ دمدار ستارہ منحوس ہوتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" عورت مسکرا کر بولی۔

"میرا نام انور سعید ہے۔" انور مسکرا کر بولا۔ "لوگ مجھے کروڑ پتی سمجھتے ہیں، لیکن مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

"تو پھر آپ سچ مچ کروڑ پتی ہیں۔ آپ واقعی بہت دلچسپ آدمی ہیں۔" عورت گھڑی دیکھ کر اپنا ہینڈ بیگ میز کے نیچے سے اٹھاتی ہوئی بولی۔

"تو کیا چل دیں۔ میں بہت اداس ہو جاؤں گا۔"

"مجھے جلدی ہے۔ گیارہ بجے میرے ایک عزیز باہر سے آ رہے ہیں۔ انہیں لینے کے لیے اسٹیشن جاؤں گی۔"

"خیر۔۔۔!" انور اداسی سے بولا۔ "پھر کب ملیں گے۔"

"کل کسی وقت ہمارے گھر آ یئے۔" عورت نے کہا اور انور سے ہاتھ ملا کر ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے باہر چلی گئی۔

انور اٹھ کر کھڑکی کے قریب آیا وہ باہر ایک چھوٹی سی خوبصورت کار میں بیٹھ رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے کار اسٹارٹ ہو گئی اور انور اپنی میز پر لوٹ آیا۔ بیرے کو بلا کر جلدی جلدی بل ادا کیا اور باہر نکل آیا۔

اور پھر جس طرف کار گئی تھی اس طرف اس کی موٹر سائیکل بھی جا رہی تھی۔ انور کی آنکھیں شرارت آمیز انداز میں چمک رہی تھیں لیکن پھر جلد ہی اُس کے چہرے پر معصومیت پھیل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی کسی عبادت

گاہ سے لوٹا ہو۔

ابھی تک وہ کار اسے نہیں دکھائی دی تھی۔ غالباً بہت زیادہ رفتار سے روانہ ہوئی تھی لیکن انور اپنی جوابی کارروائی کی طرف سے مطمئن تھا۔

وہ تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ سامنے سڑک پر بھیڑ دکھائی دی۔ شاید کوئی حادثہ ہو گیا تھا اور پھر اس انبوہ میں اسے وہ کار دکھائی دی جس کے تعاقب میں وہ روانہ ہوا تھا۔ انور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس مسکراہٹ سے درندگی اور سفّاکی جھلک رہی تھی۔

اس کی نظروں میں وہی آسودگی تھی جو ایک درندے کی نظروں میں پائی جاتی ہیں۔ اس وقت جب کہ اس کا شاندار شکار بالکل اس کے قابو میں آ گیا ہو۔

انور نے موٹر سائیکل فٹ پاتھ کے قریب کھڑی کر دی اور خود بھیڑ میں آ گیا۔

نجمہ کار کی اگلی سیٹ پر پڑی کراہ رہی تھی۔ اس کی بائیں ران کے پرخچے اُڑ گئے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نے قیمہ کر کے رکھ دیا ہو۔ ہینڈ بیگ کے

چیتھڑے سڑک پر پڑے سُلگ رہے تھے اور کار کے اندر بارود کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔

پولیس آ گئی تھی۔ سب انسپکٹر نے کہیں سے ایک ایمبولینس منگوائی اور زخمی عورت کو اس پر ڈال کر ہسپتال کی طرف لے جانے لگا۔ کار سڑک کے کنارے کھڑی کر دی گئی۔ انور نے کئی آدمیوں سے اس حادثے کے متعلق پوچھنے کی کوشش کی لیکن کسی نے کوئی تسلّی بخش جواب نہ دیا۔ کسی کو ٹھیک سے یہ نہ معلوم ہو سکا تھا کہ حادثے کی نوعیت کیا تھی۔ پھر انور چوراہے کے سپاہی کی طرف متوجّہ ہوا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔" سپاہی بولا۔ "کار یہاں سے گزر رہی تھی کہ دفعتاً ایک دھماکہ سنائی دیا اور پھر ایک چیخ۔ کار رُک گئی اور عورت اس حال میں نظر آئی۔ میرا خیال ہے کہ شاید اس کے پاس کسی قسم کا بم تھا جو پھٹ گیا۔"

"اس نے کچھ بتایا بھی۔۔۔!" انور نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بہر حال ایک ٹانگ تو بے کار ہی ہو گئی یا شاید مر جائے۔"

"انور موٹر سائیکل لے کر سیدھا ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا اور اس کمرے میں نہیں گیا جس میں وہ رکھی گئی تھی۔ اندر شاید پولیس اس کا بیان لے رہی تھی۔ انور باہر ہی ٹھہرا رہا۔ وہ اندر بھی جا سکتا تھا لیکن اس نے مناسب نہیں سمجھا۔"

تھوڑی دیر بعد ایک سب انسپکٹر اندر سے آیا۔ انور اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔

"کیوں جناب آخر آپ پہنچ ہی گئے۔" اس نے انور سے کہا۔

"ہاں جناب اسی کی روٹی کھاتا ہوں۔" انور بولا۔

"اس نے بیان دیا ہے کہ کسی نے اس کی کار پر بم پھینکا تھا۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"اور آپ نے اس پر یقین کر لیا۔"

"کیوں؟ یقین کیوں نہ کیا جائے۔"

"اگر فرض کیجیے خود اس کے پاس بم رہا ہو تو۔"

”یہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”وہ ہے کون؟“

”ایک معزّز آدمی کی بیوی ہے۔“

”یعنی۔۔۔!“

”نیشنل آئرن ورکس کے منیجر کی بیوی ہے۔“

”اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔!“ انور نے کہا اور اس کے ذہن میں پے در پے کئی سوال گونج اٹھے۔

”میں نے اسے فون کر دیا ہے وہ آہی رہا ہو گا۔“ سب انسپکٹر نے کہا اور دوسری طرف چلا گیا۔

انور تھوڑی دیر تک کھڑا سگریٹ پیتا رہا پھر دفعتاً ہسپتال کی کمپاؤنڈ سے باہر چلا گیا۔ پھاٹک کے قریب ہی چائے کی ایک چھوٹی سی دُکان تھی۔ انور وہاں جا کر بیٹھ

گیا۔ چائے کے لیے کہہ کر دروازے کے قریب کرسی گھسیٹ لایا۔ یہاں سے ہسپتال کے اندر جانے والے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک کار پھاٹک میں داخل ہوئی۔ انور نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ دوسرے لمحے میں وہ ایک کاغذ کے ٹکڑے پر بائیں ہاتھ سے لکھ رہا تھا۔

داراب کے لیے دوسری چوٹ، لیکن مجھے اپنے قیمتی سگریٹ کیس کے ضائع ہونے کا افسوس ہے۔ آئندہ کسی ملاقات میں اس کی قیمت وصول کر لی جائے گی۔

انور وہ کاغذ مُٹھّی میں دبائے ہسپتال کی کمپاؤنڈ میں آیا۔ تھوڑی دیر قبل جو کار اندر داخل ہوئی تھی پورٹیکو میں کھڑی نظر آئی۔ انور نے وہ پرچہ اس کی اگلی سیٹ پر ڈال دیا اور پھر اسی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد کار اندر سے واپس آئی اور مشرق کی طرف مُڑ گئی۔ انور کی موٹر سائیکل کافی فاصلے سے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ کار شہر کے بارونق

بازاروں سے گزرتی ہوئی ایک ویران راستے پر ہو لی۔ انور کو مجبوراً اپنی موٹر سائیکل کی رفتار کم کر دینی پڑی۔ وہ تقریباً چار فرلانگ پیچھے جا رہا تھا۔ دفعتاً اُسے خیال آیا کہ وہ سڑک آگے جا کر ختم ہو گئی ہے۔ پھر اس کے بعد ایک دریا ہے۔ وہ اکثر اس طرف تفریحاً نکل آیا کرتا تھا۔ ایک خیال تیزی سے اس کے ذہن میں گونجا اور اس نے موٹر سائیکل روک کر ایک طرف کھڑی کر دی۔

دوسرے لمحے میں وہ ایک اونچے درخت پر بندر کی سی پھُرتی کے ساتھ چڑھ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب سے اونچی شاخ پر پہنچ گیا۔ اس کے گرد و پیش میلوں تک گھنی جھونپڑیاں اور سر سبز میدان پھیلے ہوئے تھے۔ دریا کے کنارے ایک طرف چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں تھیں جن سے تقریباً ڈیڑھ یا دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک بڑی سی پختہ عمارت تھی۔ جنگ کے زمانے میں اس میں کوئی سرکاری کارخانہ تھا اور جنگ کے خاتمہ پر اسے کسی نے کرائے پر لے لیا تھا۔ انور کی نظریں اس کار پر جمی ہوئی تھیں۔ دفعتاً اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گیا۔ وہ کار اسی عمارت کی کمپاؤنڈ میں داخل ہو رہی

تھی۔

انور درخت سے اتر آیا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا لیکن دوسرے ہی لمحے میں جھنجھلا کر اسے سڑک پر پٹخ دیا کیونکہ وہ نہ جانے کب کا خالی ہو چکا تھا اور پھر اس کی موٹر سائیکل شہر کی طرف واپس جا رہی تھی۔ وہ اس وقت صرف سگرٹوں کے متعلّق سوچ رہا تھا۔

جیب میں اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ شہر پہنچتے ہی سگریٹ خرید لیے جاتے۔ بہر حال دفتر پہنچنے سے قبل اُسے سگریٹ نہیں مل سکتے تھے۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ دفتر میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ آج کی خبریں مکمّل ہو جانے کے بعد اس نے مسوّدہ ایڈیٹر کے کمرے میں بجھوا دیا اور پھر روزانہ چھپنے والے جاسوسی ناول کی قسط لکھنے لگا۔ آج کے کارناموں تک کی اِطّلاع اس نے رشیدہ کو دفتر میں آتے ہی دے دی تھی۔ رشیدہ نے اس پر کچھ تبصرہ بھی کرنا چاہا تھا لیکن انور نے یہ کہہ کر اسے روک دیا تھا کہ وہ اپنا کام مکمّل کیے بغیر کسی قسم کی گفتگو کرنا پسند نہ کرے گا۔

جاسوسی ناول کی قسط لکھ چکنے کے بعد اس نے ایک طویل انگڑائی لی اور سگریٹ سلگا کر کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ رشیدہ اس دوران میں کئی بار اس کے کمرے میں جھانک کر واپس جاچکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کام کرتے وقت وہ اس کے پاس گئی تو وہ اسے بڑی بے مروّتی کے ساتھ کمرے سے نکال دے گا۔

وہ پھر آئی اور یہ دیکھ کر انور کام ختم کر چکا ہے کمرے میں چلی آئی۔

"تم سچ مچ بہت خطرناک ہوتے جارہے ہو۔"

"میں فرشتوں سے زیادہ معصوم ہوں۔" انور کے چہرے پر معصومیت پھیل گئی۔

"اُس بے چاری کا نہ جانے کیا حشر ہوا ہو گا۔"

"بہر حال وہ مر نہیں سکتی۔" انور نے کہا۔ "البتّہ وہ سگریٹ کیس میرے جیب میں پھٹتا تو۔۔۔"

"میری نئی غزل نامکمّل رہ جاتی۔"

"تمہارا دوسرا قدم کیا ہو گا۔"

"میرا دوسرا قدم، دوسرا قدم ہو گا۔ ظاہر ہے کہ وہ تیسرا قدم ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

"پھر بد حواس ہوئے تم۔۔۔!"

"تمہاری آنکھیں بہت حسین ہیں۔"

"اتنی جلدی سارے سگریٹ پی ڈالے۔" رشیدہ منہ بنا کر بولی۔

"گھبراؤ نہیں آج کچھ آمدنی کی توقّع ہے۔ میں داراب سے اپنے سگریٹ کیس کی قیمت معہ جرمانہ اور بربادی وقت وصول کروں گا۔"

"کیوں خواہ مخواہ جان گنوا رہے ہو۔" رشیدہ بولی۔

"ڈرپوک نکل جاؤ یہاں سے۔" انور بگڑ کر بولا۔

"میں ڈرپوک نہیں ہوں۔ لیکن میں تمہیں تنہا وہاں نہ جانے دوں گی۔"

”بکو مت۔۔۔ میں تنہا جاؤں گا۔ تم بعد میں آسکتی ہو۔ سنو قریب آؤ۔“

رشیدہ اس کے قریب کرسی کھسکا لائی اور انور آہستہ آہستہ اس سے باتیں کرتا رہا۔

پھر ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر اسے دیتا ہوا بولا۔ ”یہ ساری چیزیں کسی دوافروش کے یہاں مل جائیں گی۔“

رشیدہ چلی گئی۔ انور نے کمپوزیٹر کو بُلوا کر جاسوسی ناول کی قسط اسی کے حوالے کی اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

اس کا ذہن رات کی جنگ کا نقشہ مرتّب کر رہا تھا۔ اس کے دِل میں ذرّہ برابر بھی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ اسے اپنی کامیابی پر اس طرح ناز تھا جیسے وہ اپنے ساتھ ایک بہت بڑی فوج لے جانے کا ارادہ رکھتا ہو اور پھر چند لمحوں کے بعد اس نے یہ سارے خیالات اپنے ذہن سے نکال پھینکے اور ان سگریٹوں کے متعلق سوچنے لگا جو رشیدہ اس کے لیے خریدنے گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد رشیدہ واپس آگئی۔ سگریٹوں اور سگریٹ کیس کے ساتھ اس نے

چھوٹا سا پیکٹ بھی میز پر رکھ دیا۔

انوکھا پستول

انور نے صفوفوں کی تھوڑی تھوڑی مقدار لے کر انہیں یک جا کیا اور ان میں ایک بوند پانی ڈال کر چھوٹی گولیاں بنائیں۔ پھر چند سگریٹوں کا تمباکو نکال کر میز پر پھیلا دیا۔

تھوڑی دیر کی محنت کے بعد اس کے چہرے پر آسودگی اور اطمینان کے آثار نظر آنے لگے۔ رشیدہ خاموش بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

"آخر اس کا مطلب۔۔۔!" رشیدہ بولی۔

"اس ترکیب سے تمبا کو ذرا تیز ہو جاتا ہے۔"

رشیدہ نے اس طرح منہ بنایا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو۔

"اب گھر بھی چلو گے یا نہیں، پانچ بج رہے ہیں۔" رشیدہ نے کہا۔

"میں نے اسکیم بدل دی ہے۔ تم تنہا گھر جاؤ، موٹر سائیکل لیتی جاؤ اور پھر بارہ بجے کے بعد تمہیں اختیار ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم سچ مچ زندگی سے بیزار ہو گئے۔"

"نہیں زندگی سے پیار ہے البتّہ اس صورت میں ضرور زندگی سے بیزار ہو سکتا ہوں جب اس میں یکسانیت پیدا ہو جائے۔"

"اگر یہی ہے تو پھر زندگی میں نیا پن پیدا کرنے کے لیے دوسرے طریقے بھی ہیں۔" رشیدہ مُسکرا کر بولی۔

"وہ کیا۔۔۔؟"

”جب زندگی میں یکسانیت محسوس ہونے لگے تو آنکھیں بھینچ کر گدھے کی بولی بولنا شروع کر دیا کرو۔ اگر کوئی قریب ہو تو دولتیاں بھی جھاڑ سکتے ہو۔ اگر اس سے بھی تشفی نہ ہو تو اپنے پتلون میں پیچھے کی طرف سُرخ رنگ کا ایک لمبا فیتہ ٹنکوالو۔“

انور نے قہقہہ لگایا اور رشیدہ بھی ہنسنے لگی۔

”بعض اوقات بہت پیاری لگتی ہو۔“

”پھر تم نے مکھّن کا ڈبّہ کھولا۔ اب کیا بات ہے۔ سگریٹ بھی تو لا دیے۔“

”تم کیا یہ سمجھتی ہو کہ میں فقیر ہوں۔“ انور نے بھنّا کر اپنا پرس میز پر الٹ دیا۔ اس میں سے ایک دونی گر پڑی۔

رشیدہ بے اختیار ہنس پڑی۔

”آج رات کو میں کافی امیر ہو جاؤں گا۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔

"یہ لیجئے۔" رشیدہ نے دس دس کے دو نوٹ انور کے سامنے ڈال دیے۔

"شکریہ۔۔۔ شکریہ۔" انور نوٹ سمیٹ کر جیب میں رکھتا ہوا بولا۔ "آج رات کو مع سود در سود واپس کر دوں گا۔"

"آج تمہیں شام کی چائے بھی یاد نہیں رہی۔" رشیدہ نے کہا۔

"یہیں منگواؤ۔" انور نے کہا۔ "آج میں یہاں سے نو بجے سے پہلے نہیں نکلوں گا۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"کیا تم سچ مچ یہ چاہتی ہو کہ میری غزل نامکمّل رہ جائے گی۔"

رشیدہ نے چپڑاسی کو آواز دے کر چائے لانے کو کہا اور پیار بھری نظروں سے انور کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا کاٹ کھانے کا ارادہ ہے۔" انور سہم کر بولا۔

رشیدہ جھنجھلا گئی اور اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبالیا۔

"تم انسان نہیں ہو۔" وہ مایوسانہ انداز میں بولی۔ "تم سچ مچ مشین بن کر رہ گئے ہو۔"

"اور یہی آدمیت کی معراج ہے کہ آدمی پر دکھ اور سُکھ کوئی اثر نہ ہو، خوشی اور رنج دونوں اس کے لیے بے معنی الفاظ ہو کر رہ جائیں۔ اگر دُنیا یونان کے قدیم۔۔۔ فلسفیوں کے نقشِ قدم پر چلی ہوتی تو آج نہ کوئی تپ دق میں مبتلا ہوتا اور نہ خوشی کی زیادتی کی وجہ سے کسی کا ہارٹ فیل ہوتا۔"

"تو پھر آدمی کو آدمی کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"مت کہو۔۔۔!" انور لاپروائی سے بولا۔ "جو دِل چاہے کہہ لو۔"

"مگر دکھ سکھ اختیاری چیز نہیں ہے۔ کسی احساس کو دبایا تو جا سکتا ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ سرے سے احساس ہی نہ ہو۔"

"میں اثر کی بات کر رہا تھا، احساس کی بات نہیں۔ یہ دونوں نوعیت کے اعتبار سے

بالکل مختلف ہیں۔ کسی جذبہ کا ہم پر جو اثر ہوتا ہے وہ داخلی نہیں بلکہ صدہا سال کے خارجی تجربات کا نتیجہ ہے اُسے یوں سمجھ لو کہ۔۔۔"

"بس بس ختم کرو فلسفہ۔۔۔!" رشیدہ اُکتا کر بولی۔ "میں اپنا دماغ چھلنی نہیں کرانا چاہتی۔"

"میرا بس چلے تو تمہاری کتابوں کے ڈھیر میں آگ لگادوں۔"

اتنے میں چپراسی چائے لایا۔

"خیر خیر لو چائے پیو۔" انور نے کہا۔ "یہ میں اچھّی طرح جانتا ہوں کہ ایک دِن تم بھی میری ہی طرح سوچنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔"

رشیدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سر جھکائے چائے بنانے لگی۔

"آخر تم نے یہ پیشہ کیوں اختیار کر رکھا ہے۔ کسی یونیورسٹی میں پروفیسری کے لیے کیوں نہیں کوشش کرتے۔"

”چائے پیئو۔۔۔!“ انور بُرا سامنہ بنا کر بولا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”تم آخر پولیس کو ساتھ لے کر کیوں نہیں حملہ کرتے۔“ رشیدہ تھوڑی دیر بعد بولی۔

”نہیں۔۔۔ آج میں سگریٹ کیس کی قیمت وصول کروں گا اس کے بعد دیکھا جائے گا۔“

”سچ مچ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”دماغ خراب ہونا کوئی بُری بات نہیں۔ میری طرف دیکھو۔۔۔ کتنی رسیلی ہیں تمہاری آنکھیں اور تمہارے نچلے ہونٹ کا درمیانی خم تو قیامت ہے اور یہ سلگتے ہوئے گال معلوم ہوتا ہے، شعلے نکل پڑیں گے، تم مُسکرا رہی ہو۔ ارے کیا شفق پھولی ہے اور یہ موتی جیسے دانت۔ شفق میں تارے۔۔۔ رشو کہیں سچ مچ تم سے محبّت نہ کرنے لگوں۔ مگر نہیں رشو میں دردِ دل سے بہت گھبراتا ہوں۔ بعض اوقات ریاحی دردِ دل بھی ہونے لگتا ہے، جو معدے کی صفائی کے بعد بالکل ٹھیک

ہو جاتا ہے۔ دردِ جگر کا میں قائل نہیں۔ ہاں بعض حالات میں دردِ گردہ ہو سکتا ہے۔ ویسے درد کوئی بھی اچھّا نہیں ہوتا۔ محض دردوں کی وجہ سے مُجھے اُردُو شاعری سے نفرت ہو گئی ہے۔" مُجھے دردِ دِل سے زیادہ دردِ سر اچھّا لگتا ہے۔"

"ہاں ہاں۔۔۔ محض اس لیے کہ ایک بار تمہیں تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔" رشیدہ ہنس کر بولی۔

"یہ بات نہیں رشو! میں ایک بار تفریحاً محبّت کی تھی۔ مگر وہ تفریح نہ ثابت ہوئی۔ اس لیے میں نے دوسری کوشش نہیں کی۔"

"کیا تمہیں مُجھ سے محبّت نہیں۔"

"مُجھے صرف تمہاری مردانگی سے پیار ہے۔" انور نے کہا۔ "اتنی حسین ہونے کے باوجود بھی تم میں انسائیت بہت کم ہے۔"

"تم غَلَط سمجھتے ہو۔ میں سو فیصد عورت ہوں۔"

"صرف جسمانی ساخت کے اعتبار سے۔"

"خیر چھوڑو! تم پھر آہستہ آہستہ فلسفے اور سائنس کی طرف آرہے ہو۔" رشیدہ اُکتا کر بولی۔

"اچھّا رشو!" اب تم جاؤ۔" انور گھڑی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "آج کی رات میری لیے ایک حسین رات ہو گی اور ہاں دیکھو مُجھے یقین ہے کہ باہر داراب کا آدمی ضرور ہو گا۔ تم باہر فٹ پاتھ پر نکل کر چوکیدار سے میرے متعلّق پوچھنا۔ اگر وہ اندر آنے لگے تو اُسے روک دینا۔ اس سے کہنا کہ میں اندر نہیں ہوں۔ پھر تم اس سے کہنا کہ تم میری موٹر سائیکل لیے جا رہی ہو اور وہ مُجھے اس کی اِطّلاع دے دے گا۔ یہ ساری گفتگو ذرا اونچی آواز میں ہونی چاہیے سمجھیں! اچھّا اب جاؤ۔"

"بھئی تم پولیس کی مدد کیوں نہیں لیتے۔" رشیدہ جھنجھلا کر بولی۔

"کہہ تو دیا کہ مُجھے سگریٹ کیس کی قیمت وصول کرنی ہے۔"

"تمہاری ضد تو بڑی خطرناک ہوتی ہے۔"

”رشو اب تم جاؤ ورنہ میں سچ مچ تم سے محبّت کرنے لگوں گا۔“ انور نے اُٹھ کر اسے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

”رشیدہ سمجھ گئی کہ وہ ایک نہیں سُنے گا۔ آخر کار وہ اپنا پرس اُٹھا کر چلی گئی۔“ انور نے چپڑاسی کو بلایا۔

”دیکھو یہ چائے کے برتن لے جاؤ۔ میں نو بجے تک یہاں بیٹھوں گا لیکن باہر کسی کو اِس کا علم نہ ہونے پائے کہ میں یہاں موجود ہوں اور وہاں اس طرف صحن کا دروازہ باہر سے بند کر کے تالا ڈال دینا کہ کوئی ادھر آنے نہ پائے۔ غالباً تم سمجھ گئے ہو گے، میں اِدھر کی کھڑکی سے نکل جاؤں گا۔ بس جاؤ۔۔۔ انعام کل۔۔۔!“

چپڑاسی چائے کے برتن سمیٹ کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد انور نے ایک الماری کھول کر سنہرے رنگ کے سرخی مائل بال نکالے اور اپنے گالوں پر کوئی سیال شے لگا کر ان میں وہ بال چپکانے شروع کر دیے۔ پھر اس طرح مونچھیں

بنائیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کوئی خوبصورت قسم کا جانور معلوم ہونے لگا۔ وہ تھوڑی دیر تک آئینے میں اپنی داڑھی کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے بعد قینچی نکالی اور بے ترتیب بالوں کو برابر کرنے لگا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد اس نے آئینے پر الوداعی نظر ڈالی اور اُسے پھر الماری میں رکھ دیا۔

وہ اب ایک معمّر انگریز پادری معلوم ہو رہا تھا۔ گھڑی نے آٹھ بجائے اور انور آرام کرسی پر گر کر اونگھنے لگا۔

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی گہری نیند سو جائے گا۔ ایک گھنٹے تک وہ اس طرح بے حس و حرکت پڑا رہا جیسے اس میں ہاتھ پیر ہلانے کی بھی سکت نہ رہ گئی ہو۔ جیسے ہی کلاک نے نو بجائے وہ اٹھ بیٹھا لیکن اب اس میں پہلی سی توانائی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ برسوں سے بیمار ہو۔ آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ چہرے پر مردنی چھا گئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کھڑکی کھولی

اور بر آمدے میں سنّاٹا تھا۔ نیچے پریس کی مشینوں کی گڑگڑاہٹ سُنائی دے رہی تھی۔ انور نے سوچا کہ کیوں نہ یہیں اپنے اس بھیس کا امتحان کرے۔ اپنی کمر کو قدرے جھکا کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسسٹنٹ ایڈیٹر کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کی سانس اس طرح پھول رہی تھی جیسے وہ دمہ کا مریض ہو۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر کے کمرے کے سامنے پہنچ کر وہ تین بار کھانسا اور اس کی سانس اور زیادہ پھولنے لگی۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں۔" وہ دروازے کے پاس پہنچ کر بھرائی ہوئی آواز میں انگریزی میں بولا۔

"ضرور۔۔۔ضرور۔۔۔!" اسسٹنٹ ایڈیٹر اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بولا۔

انور ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ہانپنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ گفتگو کرنے سے پہلے اپنی اُلجھی ہوئی سانسوں پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"مسٹر۔۔۔ان۔۔۔ہوف۔۔۔انور۔۔۔کہاں ملیں گے۔"

"اوہ۔۔۔وہ تو گھر چلے گئے ہیں۔ کیا آپ کو اُن کے گھر کا پتہ معلوم ہے۔"

انور نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر نے ایک کاغذ پر انور کا پتہ لکھ کر دے دیا۔

وہ تھوڑی دیر تک بیٹھا ہانپتا رہا پھر ایڈیٹر کا شکریہ ادا کرتا ہوا اُس کے کمرے سے نکل گیا۔

بر آمدے سے نکل کر وہ زینے طے کرتا ہوا فٹ پاتھ پر آ گیا۔ اس کا خیال صحیح نکلا۔ ایک آدمی بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑا آفس کے صدر دروازے کی طرف تاک رہا تھا اور وہ اسی کے قریب کھڑا ہو کر کھانسنے لگا۔ اس آدمی نے دو تین بار اُسے گھور کر دیکھا پھر جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

"اب کوئی ٹیکسی بھی نہ دکھائی دے گی۔" انور جھلّاہٹ میں بڑبڑانے لگا۔ "اور میں۔۔۔یہیں ختم ہو جاؤں گا۔"

اس آدمی نے اُسے پھر ایک بار گھور کر دیکھا اور اس کی زہریلی اور جراثیم آمیز

سانسوں سے بچنے کے لیے دوسری طرف کھسک گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک ٹیکسی دکھائی دی۔ انور نے ہاتھ اٹھا کر اُسے رُکوایا۔

"مئے پول ہوٹل۔۔۔!" وہ ٹیکسی میں بیٹھتا ہوا زور سے بولا۔ ٹیکسی چل پڑی۔
انور نے باہر کی طرف دیکھا۔ وہ آدمی بدستور وہیں کھڑا تھا۔

"مئے پول ہوٹل نہیں۔۔۔سیتا گھاٹ۔۔۔!" انور نے کُچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد کہا۔

"اچھّا صاحب۔۔۔!" ڈرائیور نے کہا۔ "کیا واپسی بھی ہوگی۔"

"نہیں۔"

"تو صاحب کرایہ دگنا پڑے گا کیونکہ واپسی میں وہاں سے خالی آنا پڑے گا۔"

"پرواہ مت کرو۔۔۔!" انور نے جھلّا کر کہا۔

ٹیکسی ویران راستے پر ہولی۔ سیتا گھاٹ سے تقریباً ایک میل اِدھر ہی انور نے

ٹیکسی رکوائی اور کرایہ ادا کر کے نیچے اتر گیا۔ ڈرائیور ویرانے میں اترنے کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ وہ کُچھ خوفزدہ سا نظر آنے لگا تھا۔ کرایہ ملتے ہی اس نے ٹیکسی شہر کی طرف موڑ دی اور کافی تیز رفتاری سے چل پڑا۔

انور نے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور تیز قدموں سے گھاٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ چاروں طرف گہرا اندھیرا تھا۔ سنّاٹے میں اس کے قدموں کی آہٹ دور تک گونج رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دریا کے کنارے بنی ہوئی عمارت کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو رہا تھا۔ باہر کوئی نہیں دکھائی دیا۔ اس نے بہ آسانی پھاٹک کھولا اور احاطے میں گھُس گیا۔ اب بوڑھوں اور مریضوں کی طرح نہیں چل رہا تھا۔ برآمدے پر پہنچ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔ ایک آدمی نے دروازہ کھول کر باہر سر نکالا۔

”کون ہے۔“

”بے وقوف یہ رسمی باتوں کا وقت نہیں ہے۔“ انور اُسے دھکا دے کر اندر گھُستا

ہوا بولا۔

"سردار کہاں ہیں۔"

"اوپر۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔!"

"اوہ وقت مت برباد کرو۔" انور جھنجھلا کر بولا۔ "مُجھے راستہ بتاؤ آگے چلو۔۔۔ آگے چلو!"

انور نے اُسے جلدی جلدی کہہ کر آگے بڑھانا شروع کر دیا۔ وہ اس کے آگے چلنے لگا۔

"جو کام ہوتا ہے، گڑبڑ ہوتا ہے۔" انور بڑبڑانے لگا۔ "سب سو رہے ہیں۔ کیا تم تیز نہیں چل سکتے۔"

راستے میں دو ایک آدمی اور ملے، جو انور کو تیز نظروں سے گھور رہے تھے۔

"تم سب اسی طرح سوتے رہنا اچھّا۔" انور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ان سے قہر

بھرے انداز میں کہتا گیا۔

پھر وہ دونوں سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ اوپر ایک ہی قطار میں کئی کمرے تھے۔ آخری سِرے پر ایک اور زینہ تھا، جو تیسری منزل کے لیے تھا۔ ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اُس آدمی نے اس طرف اشارہ کیا۔

"اچھّا اب تم جاؤ۔" انور آہستہ سے بولا۔ "پھاٹک پر نظر رکھنا جو کوئی بھی اندر داخل ہونے کی کوشش کرے اُسے فوراً گولی مار دینا۔ اچھّا اب جاؤ۔ جلدی کرو۔ تم سب اُدھر کا خیال رکھنا۔"

وہ آدمی نیچے اتر گیا۔ انور کے چہرے پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازے کھلے ہوئے تھے۔ لیکن ایک سیاہ رنگ کا پردہ درمیان میں حائل تھا۔ انور نے جھانک کر دیکھا۔ وہی داڑھی والا اجنبی ایک بڑی سی میز پر بیٹھا کُچھ کاغذات دیکھ رہا تھا۔

انور پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اجنبی چونک کر کھڑا ہو گیا۔

اس کا ہاتھ بے اختیار جیب کی طرف گیا لیکن دوسرے ہی لمحے میں انور کا پستول جیب سے نکل آیا تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہاتھ اوپر اٹھائے رکھو۔" انور نے آہستہ سے کہا۔

"تم کون ہو۔۔۔!" وہ ہاتھ اوپر اٹھاتا ہوا بولا۔

"کوئی غیر نہیں ہوں۔" انور نے مُسکرا کر کہا۔ "میں بھی چہرے پر نقلی داڑھی لگانا جانتا ہوں۔ میں تم سے جھگڑا کرنے نہیں آیا۔ میں اپنے سگریٹ کیس کی قیمت چاہتا ہوں۔"

"اوہ۔۔۔ انور۔۔۔!" وہ مُسکرا کر بولا۔ "آخر کار تم نے میرے ٹھکانے کا پتہ لگا ہی لیا اور اپنے ساتھ پولیس بھی لائے ہو گے۔ لیکن تم یہاں تک کیسے پہنچے۔ کیا میرے سب آدمی گرفتار ہو گئے۔"

"نہیں قطعی نہیں۔ وہ سب نیچے گل چھڑے اڑا رہے ہیں۔ میرے لیے کوئی چیز ناممکن نہیں۔ تمہارا خیال غلَط ہے۔ میں بالکل تنہا ہوں۔ اگر مجُھے سگریٹ کیس کی

قیمت نہ وصول کرنی ہوتی تو یقیناً اپنے ساتھ پولیس لاتا۔"

"اگر یہ بات ہے تو پستول جیب میں رکھ لو۔ میں اب بھی تم سے سمجھوتہ کرنا پسند کروں گا۔"

"حالانکہ آج تمہاری وجہ سے ایک عورت زخمی ہو گئی ہے جسے میں بے حد چاہتا ہوں۔ لیکن تم نے اس کے خلاف پولیس کو کوئی بیان نہیں دیا۔"

"اسی سے تم میری نیّت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔" انور مُسکرا کر بولا۔ "مُجھے صرف اپنے سگریٹ کیس کی قیمت چاہیے۔"

"کتنی قیمت چاہتے ہو۔"

"صرف تین سو روپے۔"

"بس۔۔۔!" وہ مُسکرا کر بولا۔

"میں تم سے کوئی سودا کرنے نہیں آیا اور نہ تم ان تین سو روپیوں میں مُجھے خرید

سکتے ہو۔ میری قیمت تم نہیں ادا کر سکتے اور پھر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر مُجھے یہی کرنا ہو گا تو جب چاہوں گا تمہیں بیچ بازار میں لوٹ لوں گا۔" انور سنجیدگی سے بولا۔

"خیر۔۔۔ خیر۔۔۔!" وہ میز کی دراز کھول کر نوٹوں کا بنڈل نکالتا ہوا بولا۔ "یہ لو! میں تم سے جھگڑا کرنا نہیں چاہتا۔"

اس نے کُچھ نوٹ گِن کر انور کی طرف بڑھا دیئے لیکن دوسرے ہی لمحے میں انور کو ایک گہرے صدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ نوٹ تو اس کے ہاتھ میں آ گئے لیکن پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر داراب کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے قہقہہ لگایا۔

"داراب سے اُلجھنا ہنسی کھیل نہیں انور۔ اب میں تمہیں چوہے کی موت مار ڈالوں گا۔"

"خیر میں مرنے کے لیے تو ہر وقت تیّار رہتا ہوں۔" انور نوٹوں کو کوٹ کے

اندرونی جیب میں رکھتا ہوا بولا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ داراب اس کی اس لاپروائی پر جھلّا گیا۔ اس نے نشانہ لے کر پستول کی لبلبی دبادی۔ مگر اُس میں سے گولی کے بجائے ایک سگریٹ نکل کر انور کی گود میں آگرا۔ انور نے قہقہہ لگایا۔

"یہ پستول نہیں بلکہ پستول نما سگریٹ کیس ہے پیارے۔"

داراب نے جھلّاہٹ میں پستول انور پر کھینچ مارا جسے اس نے ہاتھوں پر روک کر جیب میں رکھ لیا اور سگار لائٹر سے سگریٹ سلگانے لگا۔

"دیکھو داراب میں اس قسم کے ہتھیار اپنے پاس نہیں رکھتا جن سے شور پیدا ہو۔ میں عموماً گلا گھونٹ کر مارتا ہوں۔" انور منہ سے سگریٹ کا گنجان دھواں نکالتا ہوا بولا۔

"لیکن اب تم یہاں سے بچ کر نہیں جاسکتے۔ میں تمہیں بہت اذیت دے کر ماروں گا۔" داراب گرج کر بولا اور ساتھ ہی اس کا ہاتھ میز پر لگے ہوئے ایک بٹن پر پڑا۔

سارے مکان میں بے شمار گھنٹیاں بجنے لگیں۔ لیکن انور کے اطمینان میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ بدستور بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔

باہر کئی قدموں کی آہٹیں سُنائی دیں اور تین چار آدمی کمرے میں گھُس آئے۔

"بیٹھ جاؤ۔۔۔ داراب اب مجُھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" انور پُر اطمینان لہجے میں بولا۔

"مت بکو۔۔۔!" داراب چیخا۔

"تم نے شیلا رانی کو کیوں قتل کیا۔"

"میری خوشی۔۔۔!"

"تم کرنل جاوید کو کیوں اغوا کر لائے۔"

"تم سے مطلب۔۔۔!"

"مطلب یہ کہ تم مجُھے قتل نہیں کر سکتے اور ہاں صابر کو کب ختم کر رہے ہو۔ اس

کے منیجر کی بیوی تو تمہاری محبوبہ نکلی۔"

"تم دیکھنا کہ کس بے دردی سے تم مارے جاتے ہو۔" داراب بڑبڑایا۔

"ایسا نہ کہو پیارے میں تم سے بہت محبّت کرتا ہوں۔"

"بکواس بند کرو۔" داراب پھر چیخا۔

"مہمانوں سے ایسا برتاؤ نہیں کیا کرتے اور تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس وقت تم سب کی جانیں میری مُٹھّی میں ہیں۔ تم اس سے زیادہ احمق ثابت ہوئے ہو جتنا میں تمہیں سمجھتا ہوں۔"

"کیا بکتے ہو۔"

"یقین نہ آئے تو اس سگریٹ کے ٹکڑے کی طرف دیکھو۔" انور جلتے ہوئے سگریٹ کا ٹکڑا فرش پر ڈالتے ہوئے بولا اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دفعتاً سگریٹ کے ٹکڑے سے ایک چمکدار شعلہ نکلا۔ اس کی روشنی اتنی تیز تھی کہ ان سب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور پھر کمرے میں سفید رنگ کا گہرا دھواں بھر

گیا۔ اتنا گہرا کہ ایک فٹ دور کی چیزیں بھی نہیں دکھائی دے رہی تھیں۔ انور نے ایک جست لگائی اور کمرے سے صاف نکل گیا۔

خوفناک درندہ

انور باہر نکل کر نیچے کی طرف جھپٹا مگر کچھ اور آدمی اوپر آرہے تھے۔ وہ اوپری منزل کے زینوں کی طرف پلٹ پڑا۔ اوپری منزل بالکل ویران تھی۔ یہاں کمرے نہیں تھے۔ چھت بالکل سپاٹ تھی۔ ایک طرف لکڑی اور لوہے کا انبار تھا۔ کچھ بڑے بڑے پیپے بھی رکھے ہوئے تھے۔

”اوپر گیا ہے۔۔۔ اوپر۔۔۔!“ کچھ آوازیں سُنائی دیں اور انور خالی پیپوں کی آڑ میں دبک گیا۔ سامنے ایک بڑا سا پتھّر پڑا ہوا تھا۔ انور کے ذہن میں ایک نیا خیال پیدا ہوا۔ اس نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ دریا لہریں لے رہا تھا۔ زینوں پر قدموں

کی آہٹ سُنائی دی اور انور نے وہ پتھّر اٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔ ایک زبردست چھپاکے کی آواز آئی۔

"کود گیا۔۔۔ کود گیا۔۔۔!" کسی نے کہا۔ کئی ٹارچوں کی روشنیاں دریا کی سطح پر پڑ رہی تھیں۔

"چلو۔۔۔ چلو۔۔۔ بچ کر جانے نہ پائے۔۔۔ نیچے کشتی موجود ہے۔"

وہ پھر اُلٹے پاؤں بھاگتے ہوئے نیچے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد انور نے پھر جھانک کر نیچے دیکھا۔ چار پانچ آدمی ایک کشتی پر بیٹھے دریا میں چکّر لگا رہے تھے۔ اس نے پیپوں کی آڑ سے نکل کر ایک طویل انگڑائی لی اور خود بخود مُسکرانے لگا۔ چند لمحے کُچھ سوچتا رہا پھر پیٹ کے بل چھت پر لیٹ گیا۔ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا چھت کے دوسرے کنارے پر نکل گیا۔ تھوڑی دور ہٹ کر داہنے طرف ایک چھوٹا سا پائپ نیچے تک چلا گیا تھا اور تقریباً دس فٹ نیچے دیوار میں کافی چوڑی کارنس تھی۔ انور پائپ کے سہارے کارنس پر اتر آیا اور دیوار سے چپکا ہوا اس درخت کی

طرف بڑھنے لگا جس کی شاخیں دیوار کو چھو رہی تھیں۔ وہ تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ اُسے پھر رُک جانا پڑا۔ آگے اس کمرے کی کھڑکی تھی جس میں داراب سے وہ ملا تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ انور نے آگے بڑھ کر اندر جھانکا۔ کمرہ خالی تھا۔ دفعتاً اس کے ذہن میں کُچھ نئے قسم کے کیڑے کلبلائے اور وہ آہستگی سے کمرے میں اتر گیا۔

وہ میز کی طرف گیا اور پنسل اٹھا کر کُچھ لکھنے لگا۔ اچانک باہر قدموں کی آواز سُنائی دی۔ انور چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میز کے پیچھے بڑی سی لکڑی کی الماری رکھی ہوئی تھی۔ دوسرے لمحے میں وہ اس الماری کے پیچھے تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور داراب دو آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

”تم لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ڈوب گیا۔“ داراب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ان آدمیوں سے کہا۔ اس کی نظر کاغذ پر پڑی جس پر انور نے کُچھ لکھا تھا۔

”ارے۔۔۔!“ وہ بے اختیار اُچھل پڑا۔ چند لمحے ٹکٹکی لگائے کاغذ کی طرف دیکھتا

رہا پھر اُن آدمیوں کو مخاطب کر کے بولا۔ ''دیکھا تم نے۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔ وہ ابھی اسی کمرے میں تھا۔ وہ اب بھی یہیں قریب ہو گا۔''

''ہمارے آدمی اُسے جھاڑیوں میں تلاش کر رہے ہیں۔'' ایک نے کہا۔

''اب اُس کا خاتمہ ہی بہتر ہے۔'' داراب بولا۔ ''مُجھ سے بڑی غَلَطی ہوئی۔ مُجھے پہلے ہی اسے ختم کر دینا چاہیے تھا۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ کام کا آدمی ہے اگر کسی طرح اپنے ساتھ مل جائے تو کیا کہنا۔۔۔ یہ اچھّی طرح سمجھ لو کہ اگر وہ اس وقت بچ گیا تو ہمیں یہ عمارت چھوڑنی پڑے گی۔۔۔ ابھی پولیس کو ہمارے جائے رہائش کا علم نہیں ہوا۔''

''کہیں وہ ہمارے کسی آدمی پر اندھیرے میں وار نہ کرے۔'' ایک بولا۔

''مطمئن رہو۔ اُس کے پاس پستول نہیں ہے۔''

''تو کیا وہ نہتا ہم لوگوں میں گھُس آیا ہے۔'' ایک آدمی متحیّرانہ انداز میں بولا۔

''میرا خیال ہے کہ اس کا دماغ خراب ہے، بہرحال اس کا زندہ رہنا ٹھیک

نہیں۔۔۔کم بخت جونک کی طرح لپٹ جاتا ہے۔"

"انور الماری کے پیچھے بیٹھا مُسکرا رہا تھا۔ لیکن اچانک ایک نئی مصیبت نازل ہوئی۔ یہ کمبخت اس وقت ناک میں سر سراہٹ کہاں سے؟ اس نے لاکھ کوشش کی۔۔۔ مگر چھینک آ ہی گئی۔۔۔ اور چھینک بھی ایسی فلک شگاف کہ کمرہ گونج کر رہ گیا۔ انور کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ چھینک نہیں بلکہ رائفل کی گولی تھی جو اس کے سینے سے پار ہو گئی۔ اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے اور دوسرے ہی لمحے میں داراب پستول لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔"

"باہر نکلو۔۔۔!" داراب گرج کر بولا۔

انور چپ چاپ ہاتھ اٹھائے ہوئے باہر آ گیا حالانکہ اس اچانک حادثے کی وجہ سے جس کے لیے وہ قطعی تیّار نہیں تھا اس کی ہمّت جواب دے گئی تھی۔ مگر وہ برابر مُسکرائے جا رہا تھا۔

داراب نے اس کا گریبان پکڑ کر اپنے گروہ کے آدمیوں کی طرف دھکیل دیا۔

انور جیسے ان پر گرا انہوں نے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"ابھی بچّے ہو۔" داراب طنزیہ انداز میں قہقہہ لگا کر بولا۔

انور نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ لیکن اب کوئی گنجائش نہ رہ گئی۔ اگر وہ ان دونوں کی گرفت سے آزاد ہو بھی جاتا داراب کے پستول کی گولی اُسے کب چھوڑتی۔

"لے چلو۔۔۔!" داراب دروازے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "کمرہ نمبر چار میں جہاں انور ہی کی نسل کا ایک فرد اس کا خیر مقدم کرے گا۔"

وہ دونوں انور کو کھینچتے ہوئے لے چلے۔ ان کے پیچھے داراب پستول تانے چل رہا تھا۔

"تمہاری ذرا سی حرکت تمہیں جہنّم میں پہنچا دے گی۔" داراب نے کہا۔

انور بدستور خاموش رہا۔ وہ بغیر کسی جدوجہد کے چل رہا تھا۔ اس نے بھاگنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی وہ بظاہر پُر سکون نظر آ رہا تھا لیکن ذہن میں انتشار برپا تھا۔ وہ

لوگ زینے طے کر کے نیچے صحن میں آئے۔ ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر دونوں رک گئے۔ داراب نے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ اندر اندھیرا تھا۔ انور کو اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر لیا گیا اور پھر فوراً کمرے کا بلب روشن ہو گیا۔ سامنے نظر پڑتے ہی انور کے اوسان خطا ہو گئے۔

ایک خوفناک ریچھ ایک جالی دار کٹہرے سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کمرہ کافی بڑا تھا جسے درمیان میں لوہے کی سلاخوں کو جالی دار کٹہرا لگا کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ کٹہرا چھت سے ملا ہوا تھا۔ کٹہرے کی چھوٹی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ قبل اس کے کہ ریچھ اس پر حملہ کرتا وہ جھپٹ کر کٹہرے پر چڑھنے لگا۔ چھت کے قریب پہنچ کر وہ کٹہرے میں چھپکلی کی طرح چپک گیا۔

مگر اس طرح جان بخشی مشکل تھی۔ ریچھ پہلے تو اُسے تھوڑی دیر تک نیچے سے دیکھتا رہا پھر اس نے بھی کٹہرے پر چڑھنے کی ٹھانی۔ انور کے سارے جسم سے پسینہ چھوٹ پڑا۔ لیکن اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنی ٹائی کھول کر گردن سے کھینچ لی اور پھر سگار لائٹر نکال کر ٹائی میں

آگ لگا دی۔ جب یہ یقین ہو گیا کہ آگ بجھ نہیں سکتی تو اس نے اُسے کٹہرے پر چڑھتے ہوئے ریچھ پر پھینک دیا۔ جلتی ہوئی ٹائی اس کے گنجان بالوں سے چپک کر رہ گئی۔ ریچھ نے ایک بھیانک چیخ ماری اور تڑپ کر نیچے جا رہا۔ اسی کے ساتھ انور بھی اس طرح چیخنے لگا جیسے ریچھ نے اس پر حملہ کر دیا ہو۔ باہر داراب کے قہقہے کی آواز سُنائی دی۔ ریچھ زمین پر لوٹ لوٹ کر اپنے بالوں میں لگی ہوئی آگ بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ انور برابر چیخے جا رہا تھا۔ وہ باہر کھڑے ہوئے آدمیوں کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا تھا کہ ریچھ نے اس پر حملہ کر دیا ہے، ورنہ مُمکن ہے کوئی اور نئی مصیبت نازل ہو جائے۔

داراب برابر ہنسے جا رہا تھا۔

"کیوں انور دیکھ داراب کی قوّت۔۔۔!" وہ باہر چیخ کر بولا۔

انور اندر سے چیخا۔ "ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ بب۔۔۔ خیں۔۔۔ خیں۔۔۔ خیر۔۔۔ ارے بچاؤ۔۔۔ خیر نہیں۔۔۔ بچاؤ۔"

ریچھ ابھی تک زمین پر لوٹ رہا تھا اور اس کے حلق سے غصیلی آوازیں نکل رہی تھیں۔

انور نے اس دوران میں جیب سے رومال بھی نکال لیا تھا تاکہ دوسرے حملے پر اُسے بھی جلد از جلد استعمال کیا جاسکے۔

تھوڑی دیر کے بعد ریچھ پھر اٹھ کر کٹھرے کی طرف جھپٹا۔ رومال اور سگار لائٹر پہلے ہی سے تیّار تھے۔ جیسے ہی انور نے سگار لائٹر جلا دیا۔ ریچھ غرّا کر پیچھے ہٹ گیا انور ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد پھر چیخنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر سگار لائٹر جلا کر ریچھ کو دھمکی دی اور ریچھ گھبرا کر کٹھرے میں گھُسنے لگا۔ ابھی اس کا آدھا دھڑ باہر ہی تھا کہ انور نے رومال میں بھی آگ لگا کر اس پر ڈال دیا۔ وہ چیخ کر اندر گھُس گیا اور پھر زمین پر لوٹنے لگا۔ انور پھرتی سے نیچے اترا اور کٹھرے کی کھڑکی بند کر کے ریچھ کے سامنے چیخنے لگا۔

”اُف۔۔۔ہائے۔۔۔ہائے۔۔۔بچاؤ۔۔۔باچ باچ۔۔۔۔باوچ۔۔۔۔!“

اور پھر اس کی آواز اس طرح ڈوبتی گئی جیسے وہ ختم ہو رہا ہو۔ پھر دفعتاً بالکل خاموش ہو گیا۔

ریچھ بدستور غرّائے جا رہا تھا۔ انور نے ایک بار پھر سگار لائٹر جلایا اور وہ سہم کر ایک کونے میں دبک گیا۔

"ختم ہو گیا۔" باہر سے آواز آئی اور قدموں کی آہٹیں دور ہوتی گئیں۔

انور کے چہرے پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ فرشتوں جیسی معصوم مُسکراہٹ، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ابھی کُچھ دیر قبل وہ اس ریچھ کو تارک الدّنیا ہو جانے کا سبق دیتا رہا ہو۔

نیکی، سچائی اور ایمان داری کی تلقین کرتا رہا ہو۔

کمرے میں چاروں طرف بڑے بڑے روشن دان تھے۔ وہ پھر کٹہرے پر چڑھنے لگا۔ احتیاطاً اس نے سگار لائٹر جلا لیا تھا۔ ریچھ دو ٹانگوں پر کھڑا ہو کر دور ہی سے فوں فوں کرتا رہا۔

انور روشن دان میں پہنچ چکا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک آہٹ لیتا رہا پھر دونوں ہاتھ باہر نکال کر چھت پر ٹیکے اور دوسرے لمحے میں اس کا پورا جسم دائرہ بناتا ہوا چھت پر تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سینے کے بل رینگنے لگا۔ چاروں طرف سنّاٹا تھا۔ وہ آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ اُسے قریب ہی کہیں پٹرول کی بُو محسوس ہوئی۔ وہ اسی طرف بڑھنے لگا۔ آگے ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں دروازہ نہیں تھا۔ غالباً یہاں زمانۂ جنگ میں جب کہ یہ عمارت فوج کے قبضے میں تھی یہاں سنتری کھڑا ہوتا رہا ہو گا۔ انور اس کے قریب جاکر رُک گیا۔ پٹرول کی بُو اس کے اندر سے آرہی تھی۔ وہ اس کے اندر گھُس گیا۔ یہاں کئی کنستروں میں پٹرول رکھا تھا۔ انور کے دماغ میں پھر کیڑے کلبلائے۔ وہ چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ایک طرف ایک موٹی سی رسّی کا لچھّا پڑا ہوا تھا۔ وہ کوٹھری سے نکل کر چھت کے کنارے پر آیا۔ نیچے اندھیرے کی چادر پھیلی ہوئی تھی اور دریا کے بھرے سینے پر ستاروں کا عکس ناچ رہا تھا۔ انور نے لوٹ کر رسّی کا لچھّا کھولا اور اس کا ایک سِرا کوٹھری کے گرد باندھ دیا۔ پھر پٹرول کے کنستر نکال نکال کر چھت پر الٹنے لگا۔ اور رسّی کو بھی

پٹرول میں بھگو کر اس کا دوسرا سِرا نیچے پھینک دیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ اس رسّی کے سہارے نیچے اُتر رہا تھا۔ زمین پر پیر ٹکتے ہی اس نے سب سے پہلے دریا میں اپنے ہاتھ دھوئے اور پھرتی سے دیوار کی طرف پلٹا۔ پھر سگریٹ لائٹر جلا کر رسّی میں آگ لگا دی۔

اب وہ جھاڑیوں میں گھُس کر گھنے جنگل کی طرف بھاگ رہا تھا۔ تھوڑی دور جا کر وہ پلٹا۔

عمارت سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ پھر شور بھی سُنائی دینے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ دفعتاً دور کہیں موٹر سائیکل کی آواز سُنائی دی اور انور نے بے تحاشہ سڑک کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔

سڑک تک پہنچتے پہنچتے موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ دکھائی دینے لگی۔ وہ بدستور اسی طرف بھاگتا رہا۔

پھر اچانک سڑک کے بیچ میں آکر دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔ موٹر سائیکل رک گئی اور

سوار کا ہاتھ بے اختیار جیب کی طرف گیا۔

"شو۔۔۔شو۔۔میں ہوں۔" انور نے کہا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔

"تم۔۔۔!" رشیدہ ہنس کر بولی۔ "یہ تم نے اپنے چہرے پر داڑھی کیوں لگا رکھی ہے۔"

"پھر بتاؤں گا۔۔۔؟ تم فوراً واپس جاؤ۔ میں نے اس عمارت میں آگ لگا دی ہے۔"

"ارے جنگلی۔۔۔!" رشیدہ ہنس کر بولی۔

"پستول لائی ہو تو مُجھے دے دو۔۔۔ اور ہاں یہ روپے رکھو سگریٹ کیس کی قیمت وصول کر لی گئی۔ اچھّا جاؤ۔ جلدی کرو۔ ضد مت کرو۔ یہ لوگ اب یہاں سے کہیں اور بھاگیں گے اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر ان کا ہاتھ لگنا مشکل ہے۔"

"تو کیا ہوا ہم دونوں ساتھ رہیں گے۔"

”نہیں بلکہ ساتھ مریں گے۔“ انور جھلا کر بولا۔

”یہ میری دِلی خواہش ہے۔“

”میں چانٹا مار دوں گا۔“

”میرے بھی ہاتھ ہیں۔“

”خُدا کے لیے جاؤ تم یہاں سے۔“ انور دانت پیس کر بولا۔

بدقّت تمام اس نے رشیدہ کو واپس کیا اور پھر جنگل میں گھُس کر عمارت کی طرف چل پڑا۔ ایک طرف کُچھ لوگ آگ بجھانے میں مشغول تھے۔ غالباً یہ وہ ملّاح تھے جو دریا کے کنارے جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ سڑک پر ایک بڑی سی لاری کھڑی تھی جس پر سامان لادا جا رہا تھا۔

ایک آدمی کسی کو پیٹھ پر لادے ہوئے باہر آیا۔ اس کے ہاتھ پیر رسیوں سے جکڑے ہوئے تھے۔

اُسے بھی لاری میں ڈال دیا گیا۔ انور نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور جھاڑیوں میں دبکتا ہوا لاری کی طرف بڑھنے لگا۔ آہستہ آہستہ شور کم ہوتا جارہا تھا۔ غالباً ان لوگوں نے آگ پر قابو پالیا تھا۔

معزّز لٹیرا

تین بجے رات کو انور اپنے فلیٹ میں بیٹھا رشیدہ کے سامنے اپنے کارنامے دہراتا رہا تھا اور رشیدہ بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔

"اور پھر وہ لاری چل پڑی۔ انور سگریٹ سلگاتا ہوا بولا اور میں لاری کی چھت پر چِت لیٹا ہوا تاروں بھرے آسمان سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ نیچے داراب اور اس کے ساتھی میری شان میں قصیدہ پڑھ رہے تھے۔ میرے قتل کے لیے اسکیمیں بنائی جا رہی تھیں اور میں ان کے سروں پر لیٹا ہوا ستاروں کو آنکھ مار رہا تھا۔ مگر رشو میں تمہاری زندگی کا راز جاننا چاہتا ہوں۔ کیا واقعی تمہاری شخصیت اتنی پُر

اسرار ہے جتنی داراب سمجھتا ہے۔"

"کیا مطلب۔۔۔!" رشیدہ چونک کر بولی۔

"داراب تمہاری گرفتاری کے امکانات پر بھی غور کر رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ اسے تمہارے متعلّق ایک گہرے راز کا علم ہو گیا ہے اگر وہ کسی طرح تمہیں پکڑنے میں کامیاب ہو جائے تو لاکھوں روپے کمائے گا۔"

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔" رشیدہ بے اختیار کھڑی ہو کر بولی۔

"قطعی میں تم سے جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لیے میں وہ راز جاننا چاہتا ہوں تاکہ تمہاری حفاظت کی جا سکے۔"

"تم میری حفاظت نہیں کر سکتے۔ رشیدہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ میری حفاظت کا دارومدار ہر اس شخص کی موت ہے جو میرے راز سے واقفیت رکھتا ہے۔ داراب کا خاتمہ پھانسی کے تختے سے پہلے ہو جانا چاہیے۔"

"تو تم مُجھے کُچھ نہیں بتاؤ گی۔"

”میں ابھی مجبور ہوں۔“ رشیدہ فکر مند لہجے میں بولی۔ ”ویسے میرے لیے سب کُچھ تم ہی ہو۔“

”مجبوری کیسی؟“

”تم نہیں سمجھتے اور نہ میں ابھی تمہیں کُچھ سمجھا سکتی ہوں۔ اب یہاں میرا رہنا ٹھیک نہیں۔ میں جا رہی ہوں۔ تم کم از کم ایک ہفتے کی چھٹّی کے لیے درخواست دے دینا۔“

”لیکن تم جاؤ گی کہاں۔“

”کہیں اور۔۔۔ اب میں یہاں قطعی غیر محفوظ ہوں۔ داراب کی موت سے پہلے میں تمہیں نہ مل سکوں گی۔ اور وہ گروہ اب کہاں ہے۔“

”شہباز پور کے شاہی سرائے میں۔ میرا خیال ہے کہ وہ عمارت بھی پہلے ہی سے ان کے قبضے میں تھی۔ لیکن رشو! میں تمہیں اس طرح نہ جانے دوں گا۔“

”میں وہاں تنہا نہ جاؤں گی۔ تم مطمئن رہو۔ لیکن مجھے روکنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ

میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"یہاں اس مکان میں تو اب میں بھی محفوظ نہیں ہوں۔ مُجھے کوئی نہ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ پھر ہم ساتھ ہی کیوں نہ رہیں۔"

"نہیں۔۔۔!" رشیدہ نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں میرا کہنا ماننا ہی پڑے گا۔ تم نے مُجھے جو تین سو روپے دیے ہیں ان میں سے سو تم اپنے پاس رکھو۔ دو سو میں رکھوں گی۔"

"تم سب لے جاؤ۔"

"نہیں۔۔۔!" رشیدہ نے کہا اور گِن کر سو روپے اسے دیتے ہوئے بولی۔ "موٹر سائیکل بھی میں لے جاؤں گی۔"

انور خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ اس وقت رشیدہ اسے انتہائی پُراسرار معلوم ہو رہی تھی۔

آج سے قبل اس نے اس کی آنکھوں میں اتنے پختہ ارادوں کی جھلک نہیں دیکھی

تھی۔

"میرے ساتھ نیچے تک چلو۔" رشیدہ نے انور سے کہا۔

دونوں نیچے آئے۔ انور نے گیراج کھول کر موٹر سائیکل نکالی۔ دوسرے لمحے رشیدہ اس پر بیٹھ چکی تھی اور موٹر سائیکل ویران سڑک پر فرّاٹے بھر رہی تھی۔

انور پھر اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ اپنے کمرے سے بر آمد ہوا تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی انور ہے جس کے چہرے کی جاذبیت نہ جانے کتنے دِلوں میں گدگدیاں پیدا کرتی تھی۔ اس کے چہرے پر پڑی ہوئی مصنوعی پھنسیوں میں مرہم لگا ہوا تھا۔ مُنہ سے رال بہہ رہی تھی اور آنکھ اس طرح بنائی گئی تھی جیسے وہ کانا ہو۔ سنہرے بالوں میں سیاہ رنگ کے خضاب نے تنفّر آمیز گدلا پن پیدا کر دیا تھا جسم پر انتہائی کثیف اور بدبودار کپڑے تھے۔ ہاتھ میں ایک بھدّا سا ڈنڈا تھا۔

اور دوسری صُبح کو وہ اسی ہیئت میں انسپکٹر آصف کے گھر میں بیٹھا ہوا اس سے

سرگوشیاں کر رہا تھا۔

"تم نے سچ مچ کمال کر دیا۔" آصف اسے تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ "اتنا کامیاب بھیس میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"بس استاد کو دُعائیں دیتا ہوں۔" انور ہنس کر بولا۔

"کون استاد۔۔۔!" آصف نے پوچھا۔

"انسپکٹر فریدی۔"

آصف نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ لیے۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو شائد وہ انسپکٹر فریدی کے نام گالیاں بکنا شروع کر دیتا۔ مگر اس وقت عقل مندی کا یہی تقاضا تھا کہ وہ خاموش رہے۔ وہ ان حالات میں انور سے اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔

"داراب کی شخصیت پولیس کے لیے انتہائی پُر اسرار ہے۔ ہم یہ ثبوت کہاں سے بہم پہنچائیں گے کہ وہ داراب ہے۔"

”کیا یہ کافی نہیں کہ تم اغوا شدہ کرنل کو اس کے قبضے سے برآمد کر لو گے اور پھر اس کے بعد کے معاملات مُجھ پر چھوڑ دو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔“

”حملہ رات ہی کو مناسب ہو گا۔“ آصف بولا۔

”یہ سب سے بڑی حماقت ہو گی۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”دِن میں ہم قصبہ والوں کی بھی مدد حاصل کر سکیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ داراب بچ نکلے۔ ورنہ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہو جائے گا۔“ آصف کُچھ سوچنے لگا۔ انور پھر بولا۔ ”ان کے پاس اسلحے کا کافی ذخیرہ ہے اس کا خاص طور پر خیال رکھنا اور تجوری والے ٹرانسمیٹر سے تو تم نے یہ اندازہ لگا لیا ہو گا کہ وہ گروہ کتنا منظّم ہے۔“

”اچھّا تم یہیں ٹھہرو۔“ آصف نے کہا۔ ”میں اِس سِلسِلے میں آفیسروں کے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔“

”ضرور۔۔۔ لیکن بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ داراب کے آدمی یقیناً میری تلاش میں ہوں گے اور ہاں میری ایک تجویز اور بھی ہے کہ چھاپہ مارنے

والے سپاہی وردیوں میں نہیں ہوں گے۔ داراب بہت زیادہ محتاط ہو گیا ہے۔"

آصف تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا پھر کپڑے پہن کر باہر چلا گیا۔

انور ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا اطمینان سے سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا۔

انور یونہی لیٹے لیٹے مُسکراتا رہا۔ دفعتاً اُسے رشیدہ کا خیال آ گیا۔ اس کے اس عجیب و غریب رویّے پر اُسے حیرت ہو رہی تھی آخر اس کی زندگی سے کونسا ایسا راز وابستہ ہے جسے وہ اس سے چھپا رہی ہے۔ داراب اسے قابو میں کر لینے کے بعد لاکھوں روپے کس طرح حاصل کر سکتا ہے۔ اسے رشیدہ اتنی پُر اسرار کبھی نظر آئی تھی وہ اس وقت معلوم نہیں کہاں اور کس حال میں ہو گی۔

وہ اچھّی طرح جانتا تھا کہ رشیدہ اسے اس راز کے متعلّق کبھی کُچھ نہ بتائے گی وہ اس کی ضدّی طبیعت سے اچھّی طرح واقف تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ داراب کو پھانسی کے تختے سے پہلے ہی مر جانا چاہیے۔ تو کیا وہ اس فکر میں ہے اگر ایسا ہے وہ ایک زبردست حماقت کرنے جا رہی ہے۔

وہ تنہا اس کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔ انور انہیں سب خیالات میں ڈوبا ہوا آرام کرسی پر ہو گیا۔

تقریباً بارہ بجے آصف نے آکر جگایا۔

"سارے انتظامات ہو چکے ہیں۔" آصف نے کہا۔ "دوسرے آفیسروں کی بھی یہی رائے ہے کہ چھاپہ دِن ہی میں مارا جائے۔" اس کے بعد وہ انتظامات کے متعلّق بتانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد کئی لاریاں اور دو تین جیپ کاریں شہباز پور کی طرف جا رہی تھیں۔ یہ سب گاڑیاں میونسپلٹی کی تھیں۔ ان پر مزدور بیٹھے ہوئے تھے۔ کدالوں پھاوڑوں اور دوسرے اوزاروں کا انبار تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کہیں سڑک بنانے جا رہے ہوں۔ جیپ کاروں پر شائد محکمہ تعمیرات کے آفیسر تھے۔ ایک لاری پر انور بھی اپنے بدلے ہوئے بھیس میں موجود تھا۔

شہباز پور پہنچ کر ان گاڑیوں نے شاہی سرائے کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ یہ ایک

بہت پرانی عمارت تھی اور شاہی سرائے کے نام سے مشہور تھی۔ ویسے درحقیقت یہ سرائے نہیں تھی۔ مزدور اپنے ہاتھوں میں رائفلیں لے کر اترنے لگے۔ لیکن شاید اس عمارت کے رہنے والے پہلے ہی بے ہوشیار ہو گئے۔ قبل اس کے کہ کوئی عمارت کی طرف پیش قدمی کرتا کھڑکیوں اور روشن دانوں سے گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ دو ایک سپاہی بھی باڑ میں مارے گئے۔ آخر کار انہوں نے جلد از جلد لاریوں اور جیپوں کی آڑ لے لی اور ادھر سے بھی باڑھ ماری گئی۔ عمارت کا صدر دروازہ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ لیکن کسی کی آگے بڑھنے کی ہمّت نہیں پڑ رہی تھی۔ انور ایک لاری کے پیچھے دُبکا ہوا تھا۔

اس نے سوچا کہ اگر کہیں یہ دروازہ بند ہو گیا تو پھر نہ جانے کب تک اس طرح فضول کارتوس برباد کئے جائیں گے۔ سارے قصبے میں ہلڑ مچ گیا تھا۔ لوگ دور ہی سے کھڑے شور مچا رہے تھے لیکن قریب آنے کی ہمّت نہیں پڑ رہی تھی۔ شاید ان کی سمجھ میں ہی نہ آیا ہو کہ یک بیک یہ کیا ہونے لگا۔ انور نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ لاری کے اندر گھُس کر اسے صدر دروازے تک ڈرائیو کر کے لے گیا۔

دوسرے ہی لمحے میں وہ اچھل کر ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔ اس دوران میں کئی گولیاں لاری کی چھت توڑ کر اندر آئیں۔ انور دروازے پر ڈٹ گیا۔ وہ اوپر کی گولیوں سے محفوظ ہو گیا تھا۔ دفعتاً ڈیوڑھی میں دو آدمی دکھائی دیئے۔ انور نے ریوالور نکال کر انہیں وہیں ڈھیر کر دیا۔

"اکیلے اندر مت جانا۔" آصف چیخا۔

"ارے اِسی لاری کی آڑ لے کر آگے کیوں نہیں بڑھتے۔" انور دانت پیس کر بولا۔ "اس کے نیچے سے پیٹ کے بل رینگ آؤ۔"

پولیس کے دس بارہ جوان لاری کے نیچے رینگتے ہوئے دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ ان میں آصف بھی تھا۔ باہر بدستور گولیاں چل رہی تھیں۔ انور وغیرہ اندر ہی جا رہے تھے کہ دفعتاً جیپ کار سٹارٹ ہوئی۔ انور چونک کر پلٹا اور بے اختیار چیخ پڑا۔

"ارے لو وہ داراب نکل گیا۔ یہ کم بخت اندر سے نکلا کیسے۔" جیپ سڑک پر

فرّاٹے بھر رہی تھی۔

"ٹھہرو۔۔۔!" آصف اسے روک کر بولا۔ "بدحواسی اچھّی نہیں۔ اب یہاں سے ہٹنا موت کو دعوت دینا ہے۔ گولیوں کی زد میں آجاؤ گے۔"

دفعتاً سڑک پر ایک موٹر سائیکل دکھائی دی جس پر ایک سکھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ موٹر سائیکل اسی سمت میں جارہی تھی جدھر داراب گیا تھا۔

"ہے۔۔۔ ہے سردار جی۔" انور زور سے چیخا۔ "ادھر ایک مجرم جیپ پر گیا ہے۔"

لیکن یہ اس کا ایک احمقانہ فعل تھا۔ موٹر سائیکل والے نے شاید سُنا بھی نہ ہو۔ کیونکہ وہ بھی کافی تیز رفتاری کے ساتھ جارہا تھا۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ انور کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرے۔ دفعتاً وہ دیوانہ وار اندر گھُس پڑا۔ اس کے پیچھے آصف وغیرہ تھے۔ اندر انہیں بہت سخت جنگ کرنی پڑی۔ یہاں بھی دو تین سپاہی زخمی ہوگئے تھے۔ اس سے باہر والوں کو بھی اندر گھُسنے کا موقع مل

گیا۔ تھوڑی دیر کی جدوجہد کے بعد مجرموں نے اسلحے پھینک دیئے اور خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔

"آصف جلدی کرو شائد داراب مل ہی جائے۔" انور دروازے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

اور وہ دونوں مسلح سپاہیوں کے ساتھ ایک جیپ میں اسی سمت روانہ ہو گئے جدھر داراب گیا تھا۔

دو تین میل کی مسافت طے کرنے کے بعد انہیں گولیاں چلنے کی آوازیں سُنائی دیں۔ کُچھ دور چل کر وہی جیپ سڑک پر کھڑی دکھائی دی جس پر داراب فرار ہوا تھا۔ اس کے اندر سے فائر ہو رہے تھے اور دوسری طرف جھاڑیوں میں کوئی اس جیپ پر گولیاں برسا رہا تھا۔ دفعتاً ایک چیخ سُنائی دی اور داراب اچھل کر سڑک پر آ رہا۔ گولی اس کی پیشانی پر لگی تھی۔ اس کے گرتے ہی جھاڑیوں سے ایک موٹر سائیکل نکل کر سڑک پر آئی جس پر ایک سکھ بیٹھا ہوا تھا۔ پولیس

افسروں نے پستول نکال لیے اور انور چونک پڑا۔

"خبر دار موٹر سائیکل روک دو۔" آصف گرج کر بولا اور موٹر سائیکل رک گئی۔

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔" سکھ مُسکرا کر بولا۔ "میں ان دس ہزار روپوں کا مستحق ہوں جو حکومت نے اسے زندہ یا مردہ گرفتار کرنے والے کے لیے وقف کئے تھے۔"

"بڑی سریلی آواز ہے سردار جی تمہاری۔" انور مُسکرا کر بولا۔

سکھ انور کو گھورنے لگا۔ خود انور نے آگے بڑھ کر اس کی داڑھی نوچ ڈالی اور سر پر بندھی ہوئی پگڑی اتار کر ایک طرف ڈال دی۔

"ارے کون۔۔۔ رشیدہ۔۔۔!" آصف اچھل کر بولا۔

"جی جناب۔" رشیدہ مُسکرا کر بولی۔ لیکن پھر فوراً ہی گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"انور کہاں ہے؟"

وہ انور کو اس کریہہ بھیس میں پہچان نہ سکی تھی۔ انور جلدی سے داراب کی لاش کی طرف متوجّہ ہو گیا۔

"کیوں آصف کیا یہ وہی شخص نہیں ہے۔" انور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "جو پلازا میں ڈائریکٹر تھا اور جس کی لاش تمہیں جلی ہوئی کار میں ملی تھی۔ اب آؤ اور قریب آ جاؤ۔ کرنل جاوید اپنی جوانی کے زمانے میں بالکل ایسا ہی تھا۔ ذرا اس کی داڑھی پر بھی زور آزمائی کرو۔ مگر اس سے کام نہ چلے گا۔ اس نے پلاسٹک میک اپ کرر کھا ہے۔"

انور نے جھک کر اس کی داڑھی کے بال نکالنے شروع کئے۔

پھر چہرے پر متعدّد جگہ چپکے ہوئے پلاسٹک کے ٹکڑے بھی نکالے اور دفعتاً چیخ کر اچھل پڑا۔

"ارے یہ تو صابر انجنیئر ہے۔"

”آداب عرض۔۔۔!“ انور جھک کر بولا۔ ”جو کُچھ میں کہہ دیا کروں اسے پتھّر کی لکیر سمجھا کرو۔ میں انسپکٹر فریدی کا شاگرد ہوں۔“ پھر وہ رشیدہ کی طرف متوجّہ ہوا، جو حیرت سے آنکھیں پھاڑے کھڑی تھی۔

”کیوں رشو ٹھیک ہے نا۔“ انور اپنی صحیح آواز میں بولا اور رشیدہ اچھل پڑی۔

”ارے یہ تم ہو! گندے۔۔۔ لیچڑ۔۔۔!“ انور ہنسنے لگا۔

”اور ہاں جناب آصف صاحب کل جو عورت کار میں ایک پُر اسرار دھماکے سے زخمی ہوئی تھی اُسے بھی حراست میں لے لینا۔ اس کا تعلّق بھی داراب کے گروہ سے ہے اور اس کے شوہر کو بھی۔۔۔ کیا سمجھے۔“

”وہ کیسے۔۔۔!“

”اس کا ثبوت میں فراہم کروں گا۔“ انور نے کہا۔ "کرنل جاوید برآمد ہی ہو گیا ہے۔ اب کوئی خاص مسئلہ باقی نہیں رہا تم ان سب کو لدواؤ۔۔۔ اور ہم لوگ چلے۔ اگر ہماری ضرورت پڑے تو کوتوالی میں بُلوا سکتے ہو۔ اور ہاں کوئی گڑبڑ۔۔۔

نہ ہونے پائے۔ دس ہزار والا انعام رشیدہ ہی کا حق ہے۔ اگر یہ اچانک بیچ میں نہ آ کودتی تو ہم داراب کی گرد کو بھی نہ پاسکتے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں موٹر سائیکل پر شہر کی جانب واپس جا رہے تھے۔

"تم نے اسے روکا کیسے۔" انور نے پوچھا۔

"اتّفاق۔۔۔ محض اتّفاق۔۔۔ اچانک جیپ چلتے چلتے خراب ہو گئی تھی۔"

"رشو اگر مار ڈالی جاتیں تو کیا ہوتا۔" انور غمناک لہجے میں بولا۔

"تو تمہارا کیا بگڑتا۔"

"بگڑتا تو کُچھ نہیں۔۔۔۔ مگر۔۔۔ رشو۔۔۔۔!"

"ہاں مگر کیا۔"

"کُچھ نہیں۔۔۔!"

"کُچھ نہیں۔۔۔ میں سمجھی شاید۔"

”چھوڑو بھی۔۔۔رشو ڈارلنگ۔۔۔مُجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

"جانور۔۔۔!“ رشیدہ نے ہونٹ سکوڑ کر کہا اور کُچھ سوچنے لگی۔

ختم شد